مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

اسلامی معاشرہ میں
عورت کا مقام

سلسلہ مطبوعات نمبر ۷

جدید ایڈیشن

اہتمام: ———— حسن خاور

مطبع: ———— حفیظ پرنٹرز

اشاعت: ———— طبع ہشتم

تاریخ اشاعت: ———— اکتوبر 2009ء - شوال ۱۴۳۰ھ

ادارہ: ———— فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19- اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

"میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص تدبر قرآن، کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی۔ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پرانے رفقا میں سے ہیں وہ نہ صرف میرے فکر سے، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے فکر فراہی سے بڑی گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے ادارہ: فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارہ 'تدبر قرآن و حدیث' کے تعاون سے وہ قرآنی فکر و فلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آ جائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصل جواب ہے۔"

حضرت الاستاذ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدظلہ العالی نے جس بے پایاں محبت و اعتماد کا اظہار اپنی محولہ بالا تحریر ——— دیباچہ تدبر قرآن ——— میں فرمایا

ہے وہ مجھ عاجز کے لیے سرتا سر اعزاز ہے۔ ان کے اور میرے درمیان اصلاً استاد و شاگرد کا رشتہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا۔ مصنف و ناشر کا رشتہ ان کی نظرِ عنایت سے ۱۹۷۶ء میں استوار ہوا۔ انھوں نے میری تعلیم و تربیت میں آج تک جو کمال رافت فرمائی اور مشقت اٹھائی ہے رسمی اسلوبِ بیان میں اس کا اظہار ناممکن ہے۔ ان سے نسبت ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ ان کے دیے ہوئے پروگرام کی تکمیل ہی میری زندگی کا مشن اور ترجیحِ اوّل ہے۔ انھوں نے جو شرف بخشا اور اپنے جس عظیم اعتماد کا اظہار فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر کے حضور ملتجی ہوں کہ وہ مجھے ان کی امیدوں کا مصداق بنائے اور فکرِ فراہی و اصلاحی کی ترویج و اشاعت کا جو زریں تاج مجھ بے مایہ فقیر کے سر پر سجایا گیا ہے اس کی لاج رکھے۔ وبیدہ اللّٰہ التوفیق!

حضرت الاستاذ کا ذوق آشنا ہوتے ہوئے میرے لیے یہ لازم تھا کہ ان کی نگارشات کو ان کے مطلوبہ پسندیدہ معیار کے مطابق پیش کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر ان پر کام شروع کر دیا ہے۔ بیک وقت شاگرد و ناشر، دونوں حیثیتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ الحمد للہ نظرِ ثانی اور از سرِ نو کتابت کا بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ پیشکش بھی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

۱۔ متن پر نہایت اہتمام سے نظرِ ثانی کی گئی ہے۔

۲۔ قرآن مجید کے تمام حوالے مکمل نقل کیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ تدبرِ قرآن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

۳۔ کتاب میں موجود تمام اقتباسات کو ان کے اصل ماخذوں سے تقابل کر کے درست کر دیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض جگہ اگر صرف ترجمہ دیا گیا تھا تو ان کی اصل عبارتیں بھی دے دی گئی ہیں۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی پیشکش کے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے اس کی دستیابی میں کچھ عرصہ تعطل رہا جس کے لیے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ اس کے امتیازی محاسن کی روشنی میں اس کے قدرداں مجھے معاف فرما دیں گے۔ اب اس کا موجودہ ایڈیشن ان شاء اللہ ہمیشہ دستیاب رہے گا۔

اس پیشکش میں ہر ممکنہ احتیاط کے باوصف، اپنی کوتاہیوں کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اس کے قارئین بھی اس کام میں حصہ لیں۔ ان کی جانب سے ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی اور بہتری کی ہر قابلِ عمل تجویز خندہ پیشانی اور شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور آئندہ اشاعتوں میں ان کا خیال رکھا جائے گا۔

اس پیشکش کی صورت میں مجھ بندۂ حقیر و فقیر سے جو خدمت بن پائی یہ سرتاسر اُس کی توفیق اور تائید و نصرت کا کمال ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

لاہور
۲۳ اپریل ۱۹۸۸ء

والسّلام
ماجد خاور

دیباچہ

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اس ملک میں عورتوں کو بگاڑنے کی جو تحریک ہمارے اربابِ اقتدار کی طرف سے پورے زور و شور کے ساتھ اٹھائی گئی اس کا احساس مجھے روزِ اول ہی سے تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس کے خطرات سے اس ملک کے دینی حس رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن مختلف اسباب سے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، میرا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور واقعہ یہ ہے کہ میں جن حالات میں گھرا ہوا تھا ان کی موجودگی میں اس کا بہت کم امکان تھا کہ یہ ارادہ کبھی پورا ہو سکتا۔ لیکن حکومت کی عنایت سے مجھے اکتوبر ۱۹۴۸ء میں پنجاب سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کر لیا گیا اور اس طرح مجھے ان بہت سے کاموں کی تکمیل کے لیے فرصت مہیا کر دی گئی جن کے لیے عام حالات میں شاید ہی میں کبھی فرصت نکال سکتا۔

جیل کی تنہائی میں جس طرح ٹھوس مطالعہ اور خالص علمی و تحقیقی کاموں کے لیے کافی وقت ملتا تھا اسی طرح اخبارات پڑھنے کے لیے بھی کافی وقت مل جایا کرتا تھا، اور ہم اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر وہ چند اخبارات نہایت تفصیل کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جو حکومت کی طرف سے ہمارے لیے مہیا کیے جاتے تھے۔ ان اخبارات کے تفصیلی مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس تحریک کی وسعتوں اور گہرائیوں کا پورا پورا اندازہ مجھے اب تک نہیں ہو سکا تھا، اس کے خطرات اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنے بادی النظر میں نظر آتے ہیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ اس ملک کی عورتیں اِس وقت ایک دوراہے پر کھڑی ہیں اور ہمارے اربابِ

کار پرداز در لگا رہے ہیں کہ ان کو اسلام کی سمت سے ہٹا کر جاہلیت کے رخ پر ڈال دیں۔ اس احساس نے مجھے بے چین کر دیا۔ اس کے بعد سے یہ خیال مجھے صبح و شام پریشان رکھنے لگا کہ اس موقع پر لوگوں تک امرِ حق پہنچانا ضروری ہے، خواہ کوئی اس کو سنے یا نہ سنے۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ جیل کی مضبوط دیواریں میری آواز کو باہر نہیں پہنچنے دیں گی، لیکن میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس چیز سے بالکل بے نیاز ہو کر کہ یہ جذبات و خیالات لوگوں تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں اور اگر پہنچ سکیں گے تو کب تک پہنچ سکیں گے، میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کر دی اور چونکہ دل کے سچے جوش کے ساتھ لکھنی شروع کی اس لیے بہت جلدی تمام کر لی۔

دل کے جذبات کاغذ کے صفحات پر آجانے کے بعد دل کا بوجھ تو بہت بڑی حد تک ہلکا ہو گیا، لیکن جیل کی پابندیوں کی وجہ سے چونکہ کتاب کی اشاعت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اس وجہ سے ادائے فرض میں ایک غم انگیز کمی محسوس ہوتی تھی اور دل چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح یہ چیز لکھوا دی ہے اسی طرح لوگوں تک اس کے پہنچانے کا سامان بھی کر دے۔ اسی دوران میں بالکل غیر متوقع طور پر ہماری رہائی کی صورت پیدا ہو گئی جس کے متعلق میرے دل کی گواہی یہ تھی کہ اس کتاب کی اشاعت کے لیے یہ غیب سے راہ کھولی گئی ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس رہائی پر خوشی بھی اسی پہلو سے ہوئی تھی، تو شاید یہ کہنا غلط نہ ہو۔

اللہ گواہ ہے کہ یہ کتاب میں نے جذبۂ خیر خواہی اور حق نصیحت سے مجبور ہو کر اپنی قوم کے لیڈروں اور اپنی دینی بہنوں کو متنبہ کرنے کے لیے لکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ پڑھنے والے بھی اسی جذبہ کے ساتھ اس کو پڑھیں گے اور اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

لاہور — والسلام

اگست ۱۹۵۰ء — امین احسن اصلاحی

تمہید

عورتوں کے اجتماعی حقوق و فرائض کا مسئلہ اسلام میں اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کسی خاص تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے معاشرتی و اجتماعی مسائل میں سے جو مسائل قرآن و حدیث میں سب سے زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان ہوتے ہیں ان میں سے شاید ایک واضح ترین مسئلہ یہی ہے۔ عورت کا درجہ خاندان میں، عورت کا مرتبہ اجتماعی زندگی میں، عورت کا موقف ریاست میں، یہ ساری باتیں تمام اصولی ہدایات کے ساتھ خود قرآن مجید میں بیان ہو گئی ہیں اور پھر ان کی ضروری عملی و قولی تشریحات صحیح احادیث میں آگئی ہیں۔ نہایت آسانی کے ساتھ صرف تھوڑی سی محنت کر کے اُن کو جمع اور ناظرین کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں ہمارے ارباب کار کے دو رُخے پن نے جس طرح ہر مسئلہ کو اُلجھا رکھا ہے اسی طرح اس مسئلہ میں بھی انہوں نے ایسی اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہمیں بہت سی ناہمواریوں کو ہموار کرنا پڑے گا۔

ایک معقول آدمی کے لیے معقول رویّہ تو یہ ہے کہ کفر اور اسلام میں سے جس پر اُس کا دل ٹھک جائے اس کو مسلکِ زندگی کی حیثیت سے اختیار کر لے اور مشکلات و موانع سے بے پروا ہو کر اس پر چل پڑے۔ حق و باطل سے قطع نظر کر کے یہ یکسوئی بجائے خود ایک بڑی اہم طاقت ہے اور جس راہ میں بھی کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل ہوتی ہے

وہ اس یکسوئی کی بدولت ہی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا میں ہمیشہ کامیابی حاصل کرنے والوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے اور اپنے اپنے مطمحِ نظر کے لحاظ سے اسی کے بل پر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے اربابِ کار نے یکسوئی کی یہ اولوالعزمانہ روش اختیار کرنے کے بجائے دو رُخے پن کی بزدلانہ روش اختیار کی ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں ہم 'نفاق' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ نفاق انسان کی ایک مہلک بیماری کی حیثیت سے تو ضرور متعارف ہے اور ہر دور اور ہر سوسائٹی میں ایسے افراد و اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں، لیکن ہمیں تاریخ میں کسی ایسی قوم کا سراغ نہیں ملتا ہے جس کے لیڈروں نے متفق ہو کر نفاق کو قومی پالیسی کی حیثیت سے اختیار کیا ہو اور اس کو اپنی مشکلات کے حل کی کلید جانا ہو۔ پوری تاریخ انسانی میں اس قسم کی کوئی قوم اگر ملتی ہے تو صرف ایک قوم ملتی ہے اور وہ بدقسمتی سے ہماری قوم ہے۔

ہمارے لیڈر حضرات متفق اللفظ ہو کر زبان سے تو اسلام اسلام پکارتے ہیں، اسلام اور اسلامی نظام ہی کو پاکستان کے قیام کا واحد مقصد قرار دیتے ہیں، اسلامی اصولوں ہی کے اندر دُنیا کے تمام موجودہ مصائب کا علاج بتاتے ہیں، حد یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں قرارداد بھی پاس کر دیتے ہیں کہ اس ملک کا دستور کتاب و سنت کی بنیادوں پر بنے گا، لیکن دوسری طرف عمل کی دنیا میں یہ حال ہے کہ اسلام کے مٹے ہوئے آثار و نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنا تو الگ رہا اسلامی تہذیب و روایات کے جو آثار انگریزی دورِ حکومت کی دستبرد سے تھوڑے بہت بچ رہے تھے ان کو بھی مٹانے اور ان کی جگہ مغربیت کو غالب کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس دعوئی کے ساتھ ہو رہی ہے کہ یہ اسلام قائم ہو رہا ہے۔ اس بات کی شہادت یوں تو ان حضرات کے ہر قول و فعل سے مل رہی ہے،

لیکن عورتوں کی اصلاح و ترقی کے معاملہ میں انہوں نے جو روش اختیار کی ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو کوئی اندھا ہی ہوگا جو ان کے اصلی عزائم کی طرف سے کسی شبہ میں رہے گا۔

ان حضرات کی یہ روش بھی کچھ کم دردانگیز نہیں تھی کہ انہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے اسلام کے بجائے غیر اسلام کو مسلمانوں پر مسلط کرنے کی ٹھانی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دردانگیز ہمارے نزدیک ان کی یہ شتر گربگی ہے کہ وہ بیک وقت کفر اور اسلام دونوں کی کشتیوں پر سوار رہنا چاہتے ہیں۔ عملاً تو یہ ساری جدوجہد مغربی جاہلیت کو مسلط کرنے کے لیے کر رہے ہیں لیکن بطور ڈپلومیسی کے اسلام کو بھی ساتھ ساتھ لگائے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان ان کی نام نہاد اصلاحات کی طرف سے بدگمان نہ ہوں اور جو زہر یہ پلا رہے ہیں اس کو شہد و شربت سمجھ کر بغیر کسی مزاحمت کے پی جائیں۔ اس منافقت کو ان حضرات نے کمال سیاست دانی سمجھ رکھا ہے اور خیال کر رہے ہیں کہ اپنی قوم کو 'فرنگیانے' کی جو لاجواب سکیم انہوں نے ڈھونڈ نکالی ہے وہ کمال اتاترک اور امان اللہ خاں کو بھی نہ سوجھ سکی، حالانکہ قومی زندگی میں نفاق کی پالیسی ہمیشہ مہلک اور تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اگر آپ اس طرح قوم کو کفر کی طرف دھکیلتے اور اسلام کی طرف بلاتے رہے تو اس کا نتیجہ صرف یہ نکلے گا کہ یہ قوم ہمیشہ کعبہ و کلیسا کے درمیان ڈانوا ڈول رہے گی۔ آپ کے دھکیلنے کی وجہ سے دو قدم اگر آگے بڑھائے گی تو آپ کے بلانے کی وجہ سے دو قدم پیچھے بھی ہٹائے گی اور اسی لیفٹ رائٹ کے دوران میں خدانخواستہ اگر کوئی قومی آزمائش پیش آ گئی تو ایسی ڈانوا ڈول قوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔

جس چیز کو یہ حضرات انتشار (DISRUPTION) کہتے ہیں اور جس کے سونگھ لینے کے لیے ان کی قوتِ شامہ اتنی تیز ہے کہ ان گوشوں میں بھی اس کی بُو پا لیتی

ہے جن گوشوں میں دُور دُور تک اس کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔وہ انتشار، اس انتشار کے مقابل میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو انتشار ان کی یہ دورُخی اور شترگربہ پالیسی پوری قوم کے فکروعمل میں پھیلا رہی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ایک طرف تو آپ اپنی مذہبی ساکھ قائم رکھنے کے لیے قوم کو اسلام اور قرآن یاد دلاتے رہتے ہیں، قوم کے اندر اپنے دین اور اپنی مذہبی روایات سے جو محبت ہے، اپنی اغراض کی خاطر اس کو جگاتے رہتے ہیں، قوم میں اپنے بزرگ اسلاف کے نقشِ قدم کی پیروی کا جو شوق دبا ہوا ہے، اپنی محبتِ اسلام کی دھونس جمانے کے لیے وقتاً فوقتاً اس رگِ حمیت کو بھی چھیڑتے رہتے ہیں اور حصولِ اقتدار کی مسابقت میں آپ میں سے ہر ایک اس اسلام بازی میں ایک دوسرے سے چار قدم آگے ہی رہنا چاہتا ہے اور دوسری طرف آپ کی یہ بھی کوشش ہے کہ قوم کی تمام بیٹیاں اور بہنیں اپنی دیرینہ تہذیب، اپنی پرانی روایات اور اپنی مانوس و معروف معاشرت کو خیرباد کہہ کے مغربی متبرجات کے رنگ میں رنگ جائیں اور بیگم آزوری اور ریٹا ہیورتھ کو اپنے لیے نمونہ اور مثال بنائیں۔ کیا کوئی دلدل اس دوطرفہ دعوت سے بھی زیادہ اس قوم میں انتشار پیدا کر سکتی ہے؟ یہ قوم جاہل ضرور ہے، لیکن کیا اتنی جاہل ہے کہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ حضرتِ فاطمہ زہراؓ اور ان کے پیش کردہ نمونوں میں کیا فرق ہے؟ یہ قوم اپنی روایات سے ناآشنا ضرور ہو گئی ہے، لیکن کیا فی الواقع اتنی ناآشنا ہو گئی ہے کہ مدینۃُ الرسولؐ اور ہالی وڈ کی تہذیب میں امتیاز نہ کر سکے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری قوم کا مزاج بگڑ چکا ہے، لیکن کیا سچ مچ اتنا بگڑ چکا ہے کہ اب وہ اسلامی تہذیب اور صریح تبرجِ جاہلیت میں بھی فرق نہیں کر سکتی؟ پھر اس مذاق سے کیا فائدہ کہ آپ قوم کو لے تو جانا چاہتے ہیں کفر کی طرف، لیکن بات بات پر اس کو اسلام بھی یاد دلاتے جا رہے ہیں؟ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ یہ قوم پورے شرحِ صدر کے ساتھ نہ تو کفر کی طرف جائے گی اور نہ اسلام کی طرف، بلکہ اپنی جگہ ہی پر ششدر

کر رہ جائے گی اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر کسی بیرونی آفت کا شکار ہو جائے گی۔

ہمارے نزدیک صحت مند قومی زندگی کے لیے ناگزیر ہے کہ قوم کے اربابِ کار قوم کو جس راستہ پر لے جانا چاہتے ہوں پوری یکسوئی اور پورے عزم کے ساتھ اسی راستہ کی طرف بلائیں اور اسی پر اس کو چلائیں۔ ایک راستہ پر قوم کو چلانا اور دوسرے راستہ کے مناظر کی دلکشیوں کی داستان سرائی کرنا نہایت ہی احمقانہ طریقہ ہے جس سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یہ جذبہ ہے جس نے ہمیں مجبور کیا کہ عورتوں کی اصلاح اور آزادی کی جو سکیم یہ حضرات اسلام کے نام سے چلا رہے ہیں، اس کا ذرا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں۔ ان کے اصل عزائم کو خود ان کی تحریروں، تقریروں اور عملی پروگراموں سے معلوم کریں۔ پھر یہ جس اسلام کا بات بات میں اپنی "اصلاحات" کی تائید میں حوالہ دیتے ہیں اس کی روشنی میں تنقید کر کے دیکھیں کہ اصلاح کا جو نہج انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ نیز اپنے پیشِ نظر مقاصد کی حمایت میں جو عقلی دلائل یہ حضرات دیتے ہیں اُن کے اندر کوئی وزن ہے یا وہ یونہی عوام فریب مغالطے ہی ہیں؟ اس کے بعد ہم عورتوں کے اجتماعی حقوق و فرائض کا وہ نقشہ پیش کریں گے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوا ہے تاکہ جو لوگ اپنے دعوائے اسلام میں سچے ہیں اور محض پالیسی کے طور پر اسلام بازی نہیں کر رہے ہیں وہ اس کو اپنی اسلامی جدوجہد میں پیشِ نظر رکھ سکیں اور جو حضرات کلمۂ حق کو باطل کی اقامت کے لیے استعمال کر رہے ہیں ان کے طلسمِ فریب کی اصل حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔

باب ۱

ہوا کا رُخ

عورتوں کی آزادی اور حقوق سے متعلق ہمارے لیڈروں کے نظریات :

ہوا کے رُخ کا اندازہ کرنے کے لیے ہم پہلے پاکستان کے بعض چوٹی کے لیڈروں اور بعض لیڈر خواتین کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ خود ان کے الفاظ سے یہ واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ حضرات اس ملک کی خواتین کو کس راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں اور ان کی اجتماعی و سیاسی ترقی سے متعلق ان کے ذہنوں میں وہ کیا منصوبے ہیں جو انہوں نے اپنے زعم کے مطابق عین اسلام سے اخذ کیے ہیں۔

۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں مغربی پنجاب زنانہ مسلم لیگ اور پاکستان زنانہ رضاکار سروس کے زیر اہتمام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جناب لیاقت علی خاں صاحب، وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا :

"عورتوں پر —— بالخصوص پڑھی لکھی اور پردے کی قید سے آزاد عورتوں پر —— ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ انہیں پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اپنی تعلیم اور آزادی سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ مثال قائم کرنی چاہیے کہ دنیا دیکھ لے کہ ایک چاردیواری میں مقید رہنے والی عورت اور اس عورت میں کیا فرق ہوتا ہے جو اپنی تعلیم کی مدد سے اپنے ملک اور اپنی قوم کو مضبوط بنانے کی جدوجہد کرتی ہے .... جب میں اپنے ہاں کی عورتوں کو بھی مردوں کے

سالمیتِ پاکستان کے استحکام کے لیے کوشاں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ یہ بات بڑی ہی مسرت بخش ہے کہ ہماری بہنوں کی ایک کثیر تعداد وزارت نیشنل گارڈز میں بھرتی ہو چکی ہے...... جو لوگ عورتوں کو فوجی تربیت دیے جانے کی مخالفت کرتے ہیں اور پرانی بوسیدہ صورتِ حال ہی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں انہیں ذرا سرحد پار ان ہزارہا چھینی ہوئی عورتوں کے حال پر نظر کرنی چاہیے جو پاکستان کی راہ تک رہی ہیں۔ اگر وہ بدقسمت عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف ہوتیں تو وہ چھینے جانے کی بجائے اپنے ناموس کی حفاظت میں کٹ مرتی[1] ہوتیں۔"

عورتوں کی آزادی کے بارے میں وزیر اعظم صاحب نے فرمایا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عورتوں کے لیے مکمل آزادی کے معاملہ میں آپ سے متفق ہوں۔ مرد عورتوں کو آزادی دیے جانے کے خلاف نہیں ہیں۔ جو بعض مرد اس کے بظاہر مخالف معلوم ہوتے ہیں انہیں دراصل کچھ منفرد[2] غلط مثالوں نے مذبذب بنا دیا ہے۔ آپ لوگوں کو آزادی صحیح طور پر استعمال کرنی چاہیے۔"

---

[1] کس قدر سچ فرمایا وزیر اعظم صاحب نے! پچھلی جنگ عظیم میں روس، فرانس، اٹلی، جرمنی، پولینڈ، جاپان وغیرہ ملکوں میں اتنی اتنی لڑائیاں ہوئیں مگر کسی عورت کو کوئی شخص ہاتھ نہ لگا سکا۔ اس لیے کہ یہ پردے کی لعنت وہاں نہ تھی اور عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف تھیں۔ خود ہمارے اسی برِ اعظم میں دیکھ لیجیے عورتیں صرف مسلمانوں ہی کی چھینی گئیں، ہندوؤں اور سکھوں کی عورتوں کے چھینے جانے کا ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا! اس لیے کہ پردے کی لعنت تو ہم پر مسلط تھی۔

[2] منفرد غلط مثالوں سے وزیر اعظم صاحب کا اشارہ غالباً آزادی کے سوءِ استعمال کے ان شاذ و نادر واقعات کی طرف ہے جو بے پردہ سوسائٹی میں کہیں ہزاروں لاکھوں میں کبھی سوءِ اتفاق سے پیش آ جایا کرتے ہیں۔ مثلاً انگلستان کی سرکاری رپورٹ متعلق نکاح و ولادت بابت ۱۹۴۷ء میں درج ہے کہ اس سال ہر تیس بچوں میں صرف ایک بچہ حرامی پیدا ہوا۔ (یہ صرف ان ناجائز اولادوں کی تعداد ہے جو غیر شادی شدہ عورتوں کے بطن سے ہوئی ہیں اور جن کا حکومت کو علم ہو سکا ہے) وزیر اعظم صاحب کا منشا یہ ہے کہ اس طرح کے منفرد واقعات نے بعض مردوں کو بظاہر شبہ میں ڈال دیا ہے، ورنہ عورتوں کی مکمل آزادی سے کس بدبخت کو اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کی برکات میں کون کافر شک کر سکتا ہے!

خواتین کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے وزیر اعظم صاحب نے فرمایا:

"اپنے سپاس نامہ میں آپ لوگوں نے کہا ہے کہ عورتوں کو مرکز اور صوبوں میں معقول نمائندگی دی جائے۔ ہر چند میں آپ کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس صوبہ کے وزارتی جھمیلوں کی موجودگی میں آپ کو (سردست) اس سے الگ ہی رہنا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہوگا عورتوں کو حکومت کے ہر محکمہ میں پوری نمائندگی دی جائے گی"۔

تقریر کے آخر میں وزیر اعظم صاحب نے ٹیپ کا بند یہ ارشاد فرمایا:

"پاکستان اس غرض کے لیے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اصول پر قائم شدہ ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے"[1]

ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب جو ماشاء اللہ پاکستانی کابینہ کے دماغ سمجھے جاتے ہیں اور اپنی مذہبی بصیرت پر انہیں خود بھی بڑا اعتماد ہے اور بہت سے دوسرے حضرات کو بھی اس باب میں ان سے بڑی خوش گمانی ہے، وہ عمر بھر کے غور و مطالعہ کے بعد عورتوں کے معاملہ میں جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس کا اظہار کراچی میں "بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس" کے آخری اجلاس میں ۶- دسمبر ۱۹۴۹ء کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمایا:

"مجھے افسوس ہے کہ ہماری اس کانفرنس میں کہیں سے کوئی عورت نمائندہ بن کر نہیں آئی[2]۔ مجھے پوری پوری امید ہے کہ تہران میں منعقد ہونے والی

---

[1] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور: مورخہ ۲۵- جنوری ۱۹۴۹ء

[2] اس دینی شعور اور مذہبی حِس کی داد دیجیے کہ پوری کانفرنس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جس ایک ہی چیز کی کمی رہ گئی تھی اس کو ہمارے وزیر مال نے کس طرح تاڑ لیا!

کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں کچھ نہ کچھ عورتیں بھی نمائندہ حیثیت سے ضرور شریک ہوں گی۔ اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت میں نے اس لیے محسوس کی کہ جب تک کسی ملک کی اقتصادی تعمیر میں عورتیں بھی پورا پورا حصہ نہ لیں اُس کی اقتصادی حالت درست نہیں کی جا سکتی۔ تمام مذاہب میں سے اسلام ہی تو تھا جس نے سب سے پہلے عورت کو سیاسیات و اقتصادیات میں عزت و احترام کا وہ مقام عطا کیا جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہیں تھا۔ پس اسلامی ممالک کو چاہیے کہ اپنے ہاں کی تمام تحریکوں میں عورتوں کو صفِ اوّل میں جگہ دے کر ان کے ساتھ انصاف کریں۔ اس کے بغیر اقتصادی بحالی ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہو گی۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہالت اور تحکمانہ ملائیت نے مسلمان عورتوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہمیں ان کو اقتصادی بندھنوں سے بھی آزاد کرانا ہے اور (مردوں کے مقابل میں) احترام اور برابری کا وہ مقام بھی ان کو دلانا ہے جو اسلام کا تقاضا ہے[1]۔

آخر میں نہایت ادب کے ساتھ یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ عمر بھر کے غور و مطالعہ[2] کے بعد اب یہ میرا ایمان ہو چکا ہے کہ اسلام کوئی جامد

---

[1] دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک کی رہنمائی کا جو مقام پاکستان کو حاصل ہے اس کے بین الاقوامی پروگرام کی بسم اللہ گویا آزادیٔ نسواں کے جہاد سے ہوئی ہے۔

[2] اگرچہ وزیر بال صاحب نے اس بات کی تصریح نہیں فرمائی کہ عمر بھر کس چیز کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نازک حقیقت تک پہنچے ہیں مگر سیاق کلام دلیل ہے کہ وہ ظاہر یہی فرمانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ساری زندگی اسلام کے مطالعہ میں بسر فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اسلام کے متعلق گل فشانیاں فرمانے اور ہر مجلس میں اس کی ترجمانی کرنے کے حق سے کس کی مجال ہے جو انہیں روک سکے۔

شے نہیں ہے۔ اسلام ایک زبردست طاقت اور ایک زندگی بخش قوت ہے۔
... مستقبل کی تعمیر میں اس کا بہت اہم حصّہ ہوگا۔ اس کی تعمیر کی ابتدا کی جا چکی
ہے۔ اب ہم میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیے کہ جس
کام کا بیڑا ہم نے اُٹھایا ہے اس کے لیے آپ اپنے کو کس حد تک تیار
کر رہے ہیں۔ ہمیں ان خیالات اور جہالتوں سے لڑنا ہے جو صدیوں سے
ہم پر مسلط ہیں۔ مگر مجھے اس میں ذرّہ برابر شک نہیں ہے کہ اگر ہم نے
اسلام کی صحیح رُوح کو پیشِ نظر رکھ کر کام کیا تو ہم اپنے مقاصد میں کامیاب
رہیں گے۔"[2]

بیگمات کے افکار و نظریات:

اب بعض بیگمات کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے جو اس
ملک کی خواتین کی لیڈر ہیں (یا جن کو اربابِ اقتدار کی جانب سے اس لیڈری کی
خدمت پر مامور کیا گیا ہے) اور جو مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ اور مثال کی حیثیت
سے بیشتر سرکاری خرچ پر اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس لیے
پھرائی جا رہی ہیں کہ یہ ہماری ماؤں اور بہنوں کو دکھائیں اور بتائیں کہ ان کو کس نمونہ

---

[1] غالباً آزادیٔ نسواں کے پروگرام کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ اب تک جاری اس سب سے بڑی اسلامی حکومت نے بین الاقوامی پیمانہ پر جس تعمیر نو کا آغاز کیا ہے اس میں عام پبلک کے سامنے نمایاں طور پر یہی چیز آ رہی ہے اور اسی چیز کی شہادت آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی رپورٹ سے بھی مل رہی ہے۔

[2] ڈیلی دی پاکستان ٹائمز، لاہور، مورخہ ۸۔ دسمبر ۱۹۴۹ء

کی تقلید کرنی چاہیے اور کیا بننا چاہیے۔

اس زمرۂ صالحات و طیبات کی گُلِ سرسبد محترمہ بیگم لیاقت علی خان ہیں۔ انہوں نے ۲۸۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو جہلم میں کالا ریفیوجی کیمپ میں جموں اور کشمیر کے پناہ گزینوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا:

"اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسلمان عورتیں گھروں کی چار دیواری میں بند بیٹھی رہیں، اب اُنہیں اس خوابِ غفلت سے بیدار ہونا ہوگا اور گھروں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لینا ہوگا۔"[1]

مردوں کو مخاطب کرکے بیگم صاحبہ نے ارشاد فرمایا:

"وہ اپنی عورتوں کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ وہ انہیں اس بات کا موقع دیں کہ وہ ان فنون کو سیکھ سکیں جن کی اہلیت اُن کے اندر پائی جاتی ہو۔"[2]

انہی بیگم صاحبہ نے ۲۶۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو لندن میں غیر ملکی اخبار نویس عورتوں کے سامنے پاکستانی عورتوں کی رفتارِ ترقی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"اگرچہ (پاکستان کی) شہری عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں اور نقاب بھی اوڑھتی ہیں، تاہم اسّی فی صد عورتیں جو دیہات میں رہتی ہیں وہ ایسا نہیں کرتی ہیں۔ نیز پردہ نشین عورتیں بھی اپنے مردوں پر ویسی ہی حاوی اور اپنے گھر کے معاملات میں ویسی ہی با اختیار ہیں جیسے کہ بے پردہ عورتیں۔"

---

[1] جموں اور کشمیر کی پناہ گزین عورتوں کے سامنے جن کے پاس نہ مکانوں کی چاردیواری ہے نہ ستر پوشی کا کوئی سامان موجود ہے، بیگم صاحبہ کی یہ تقریر ممکن ہے بعض کو بے محل معلوم ہو مگر مقصد کا سچّا عشق محل اور بے محل کے حدود کی پروا کب کرتا ہے!

[2] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور: مورخہ ۲۹۔ جنوری ۱۹۴۹ء

آپ نے مزید فرمایا:

"مغرب میں بھی تو عورتوں کے مردانہ کارروائیوں اور مصروفیتوں میں حصہ لینے کا خیال ابھی نیا نیا ہی پیدا ہوا ہے[1] بہرحال پردہ دیر سویر ختم ہو کے رہے گا۔ لڑکیوں کی نئی پود جن کی تربیت لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط درسگاہوں میں ہو رہی ہے، وہ پردہ میں نہیں جائے گی[2]۔"

کل پاکستان زنانہ ایسوسی ایشن کا ذکر اکثر اخباروں میں رہتا ہے اور ناظرین ایک حد تک اس سے واقف ہوں گے۔ یہ عورتوں کی ایک نیم سرکاری انجمن ہے جس کی سرپرست ہزایکسیلینسی بیگم خواجہ ناظم الدین اور مس فاطمہ جناح ہیں۔ بیگم لیاقت علی خاں اس کی صدر ہیں۔ اس کی شاخیں پاکستان کے ضلع ضلع میں قائم ہو چکی ہیں۔ ہر جگہ اس کی کرتا دھرتا سرکاری حکام کی بیگمات ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے اس انجمن کو باضابطہ طور پر تسلیم کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ جن معاملات کا تعلق عورتوں سے ہوگا ان معاملات میں حکومت اس انجمن سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ حکومت جس شفقت کے ساتھ اُس کی سرپرستی کر

---

[1] بیگم صاحبہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک کی شہری عورتوں کے چہرہ پر یہ نقاب کے داغ دھبے کہیں کہیں جو نظر آ جاتے ہیں، اس کے سبب سے ہمیں ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجیے۔ ابھی ہماری اسلامی ریاست کو وجود میں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ہماری خامیوں کا محاسبہ شروع کر دیا جائے۔ آخر مغرب کی عورتوں نے بھی تو اپنی موجودہ منزل تک پہنچنے میں کافی دن لگائے۔ ہماری اسلامی حکومت پر بھی کچھ دن گزرنے دیجیے پھر دیکھنا درس گاہوں کی بدولت 'جاہلیتِ قدیمہ' کا ایک نشان بھی باقی رہ جائے تو کہیے!

[2] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء

رہی ہے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اس کی کانفرنسیں بالعموم گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی ہیں[1]۔ اس کی جنرل سیکرٹری بیگم جی۔ اے خان نے اسس کے اغراض و مقاصد سے متعلق نمائندۂ پریس کو جو بیان دیا ہے وہ ملاحظہ ہو :

"یہ ایسوسی ایشن پختہ عزم رکھتی ہے کہ پاکستان کی عورتوں کو تہذیبی اعتبار سے دوسرے ملکوں کی عورتوں کی سطح پر لا کھڑا کرے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن عنقریب اپنے نمائندوں کو دوسرے ملکوں میں اس غرض سے بھیج رہی ہے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئیں کہ وہاں کی ایسی تنظیمیں کس طرح کام کرتی ہیں ..... زینت خورشید جو ایسوسی ایشن ہذا کی رکن ہیں، مذکورہ بالا مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہالینڈ جا رہی ہیں۔ جوں ہی ہمارے ارکان کی تعداد ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی ہم اقوام متحدہ کی سماجی اور اقتصادی کونسل سے الحاق کی درخواست کر دیں گی[2]۔"

یہ انجمن جس قسم کی ثقافتی و تہذیبی ترقی اس ملک کی خواتین میں پیدا کرنی چاہتی ہے اس کا اندازہ بیگم طیب جی کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس انجمن کے ایک اجلاس میں ثقافتی ترقی کے ریزولیشن پر فرمائی :

"ایک عام شکایت جو ان دنوں میں نے بہت سُنی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں (پاکستان میں) عمدہ قسم کے گانوں کا کُلی فقدان ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں گانے بجانے کے تمام اُستاد اور مُغنّین

---

[1] ملاحظہ ہو دی سیکنڈ ایئر پاکستان ۱۹۴۹-۱۹۴۸ء، ص ۲۷۶ اور ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۵ فروری ۱۹۵۰ء

[2] ڈیلی پاکستان ٹائمز، لاہور، مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۹ء

مسلمان ہی رہے ہیں تو یہ موجودہ صورت حال بہت ہی ستم ظریفانہ معلوم
ہوتی ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں گانا بجانا لڑکیوں کی تربیت کا ایک لازمی
جزو تھا اور معمولی گانا بجانا نہیں، بلکہ نہایت اونچے قسم کا۔ یہ بڑے
ہی افسوس کی بات ہے اور درحقیقت یہ ایک بہت بڑا خسارا ہے کہ
ہمارے زمانہ کی لڑکیاں معیاری اور پکے گانوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں
ہیں۔ ان کی بڑی سے بڑی امنگ بس فلمی گیتوں کے سیکھنے تک محدود
ہے۔ یہ گانے بھی اگرچہ اپنے عام انداز میں اچھے ہوتے ہیں، مگر یہ گانے
کو حقیقی حُسنِ صَوت کے امتیاز کے قابل نہیں چھوڑتے[1]۔"

اس ثقافتی ترقی کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے ایک باضابطہ ادارہ بھی قائم
ہو چکا ہے جس کو ازراہِ دینداری ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب نے
اپنی سرپرستی سے مشرف فرمایا ہے۔ اس ادارہ کا اعلان ملاحظہ ہو:

"پاکستان اکاڈمی آف آرٹ!"

پاکستان میں ناچ سکھانے کی سکیم

راولپنڈی، ۲۹۔ نومبر، مشہور پاکستانی رقاصہ[2]، آزوری (حال بیگم نزہت محمود)
نے بیان کیا کہ آئندہ سال کے شروع میں پاکستان میں جسم بنانے
(PHYSICAL CULTURE) اور جسمانی حرکات میں تناسب و
ہم آہنگی پیدا کرنے کا پہلا ادارہ قائم ہو جائے گا۔ اس کا اصل مرکز
کراچی اور ضمنی مراکز مغربی اور مشرقی پاکستان کے اہم شہروں میں ہوں

---

[1] دی سیکنڈ ایر، شائع کردہ: پاکستان پبلیکیشن ص ۴۰،۴۱
[2] یہ نامہ نگار کی کوتاہی ہے کہ اس نے بیگم صاحب کو محض "پاکستانی رقاصہ" لکھا ہے۔ وہ اپنے جذبات و حسیات کے لحاظ سے تو "اسلامی رقاصہ" کے لقب کی مستحق ہیں، اور ویسے بھی اب اس مملکتِ اسلامیہ میں کوئی شے غیر اسلامی کب رہ گئی ہے۔

گے۔ اس ادارہ کا مقصد پاکستانی عورتوں اور بچوں میں تال، سُر، صحت اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرنا ہے۔

بیگم محمود نے کہا کہ وہ اپنی اس سکیم کے سلسلہ میں غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان اور بیگم لیاقت علی خاں سے ملاقات کر چکی ہیں۔ ان دونوں صاحبوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔[1] میرے پیشِ نظر سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ رقص جو اکابر شاہانِ مغلیہ کی سرپرستی میں اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا اور اب پاکستان میں رُو بہ تنزل ہے پھر سے زندہ کیا جائے[2] اور بین الاقوامی نمائشِ فنون میں، جو ۱۹۵۱ء میں لندن میں منعقد ہو رہی ہے، پاکستان کو دُنیا کے تہذیبی نقشہ پر جگہ دلائی جائے۔

اس عظیم الشان کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلا قدم یہ ہوگا کہ آزادوری راولپنڈی میں ۱۰۔ دسمبر ۴۹ء کو رقص اور جسم بنانے کے فن کی نمائش کریں گی!

اپنے اس ادارہ کے مقاصد کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے بیان کیا کہ ان کے پیشِ نظر پاکستانی عورتوں کو صرف ناچ گانے کے فن ہی میں یکتائے روزگار بنانا نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیتوں کو تہذیب کے رنگ میں رنگ دینا اور ان کو اپنی اصل جگہ حاصل کرنے اور آئندہ تعمیرِ ملت[3] کے کاموں میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے

[1] بیگم صاحبہ نے کراچی کے اکابر و اکابرات سے ملنے ہی میں، معلوم ہوتا ہے، کوتاہی کی، ورنہ انہی دو کی کیا خصوصیت ہے۔ وہاں کے ابرار و صالحین میں سے کوئی بھی اس خالص دینی اور اسلامی خدمت میں شرکت و تعاون سے پیچھے رہنے والا نہیں ہے۔

[2] تاریخ کا جو شُدبُد تھوڑا سا مطالعہ ہمارا ہے اُس کی بنا پر یہ عرض ہے کہ یہ فنِ شریف مُغل سلاطین کے اُس دور میں اپنے کمال پر پہنچا تھا جو خود ان سلاطین کے زوال کا دورِ آخر تھا اور بیگم صاحبہ ہمارے دورِ طفولیت ہی میں اس کے کمال کی متمنی ہیں۔ جب ابتدا اسی نقطہ سے ہو رہی ہے تو دیکھیے اس کی انتہا کیا ہو۔

[3] اس مقام سے سرسری نہ گزر جائیے، بلکہ یہاں اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ہمارے معمارانِ ملت کے نزدیک "تعمیرِ ملت" کی اصطلاح کا اصل مفہوم کیا ہے اور ملتِ اسلامیہ کی تعمیر درحقیقت کن اجزاء سے ہوتی ہے۔

کے قابل بناتا ہے۔

آپ نے کہا کہ اس ادارہ کا دائرہٴ عمل صرف ناچ اور گانا سکھلانے ہی تک محدود نہیں ہوگا، بلکہ یہ بہت سے دوسرے فنون، مثلاً مصوری وغیرہ سکھانے کا بندوبست بھی کرے گا۔

'خٹک ناچ' کا ذکر کرتے ہوئے آذوری نے بڑے دعویٰ سے کہا کہ 'خٹک ناچ' مسلمانوں کا ناچ[1] ہے۔ یہ اپنی موجودہ طرز اور موجودہ کمال کو اکابر شاہانِ مغلیہ کی سرپرستی میں پہنچا۔ پاکستانی رقاصہ آذوری نے ہندوستان کے اس دعویٰ کی کہ خٹک ناچ ان کی چیز ہے پُر زور تردید کی اور اس بات کو بہت زور دے کر کہا کہ اس ناچ کو ہمیں ہندوستان والوں سے پھر حاصل کرنا[2] ہے۔"[3]

ان بیگم صاحبہ کے متعلق ایک اور اعلان بھی قابلِ ملاحظہ ہے جو ۶ فروری ۵۰ء کے "احسان" لاہور میں شائع ہوا ہے:

---

[1] یہ بھی بیگم صاحبہ کی عنایت ہے کہ انہوں نے صرف "مسلمانوں" کا ناچ قرار دیا، ورنہ انہیں تو اسے خالص اسلامی ناچ کہنا چاہیے تھا۔

[2] پاکستان کے تمام مسلمانوں کو آذوری صاحبہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک ایسے عظیم الشان قومی و ملی نقصان پر ہم کو متنبہ کیا ہے، جس کی طرف اس سے پہلے کسی کی بھی توجہ نہیں گئی۔ واہگہ کے اس پار کے نقصانات کا جب کبھی ذکر آیا تو کسی نے بزرگوں بہوؤں بیٹیوں کی بے حرمتی کا غم کیا، کسی نے مساجد و مزارات کا ماتم کیا، کسی نے ایک آہِ سرد کے ساتھ دینی مدارس اور اسلامی کتب خانوں کو یاد کیا۔ لیکن اسے اسلامی بے حسی کہیے یا دینی بے خبری کہ ہمارے بڑوں اور چھوٹوں میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہمارا خالص ملی و اسلامی ناچ "خٹک ناچ" بھی واہگہ کے اُس پار ہی رہ گیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ظالم ہندو اسے اپنائے لے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان کا ناچ ہے۔ اللہ اکبر! یہ ظلم! اگر اس ورثہٴ ملی کو بھی ہم واپس نہ لے سکے تو پاکستان بنانے سے حاصل کیا ہوا؟

[3] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور: مورخہ ۳۰ نومبر ۴۹ء

"کراچی ۲. فروری: ملک میں آرٹ کو ترقی دینے کے لیے عنقریب اکاڈمی آف آرٹ کا قیام عمل میں آجائے گا۔ مادام آزوری جو مشہور آرٹسٹ ہیں انھوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کو بتایا ہے کہ ملک کو زیادہ آرٹ آشنا بنانے کے لیے تحریک جاری کی جائے گی تاکہ پاکستان آرٹ کے لحاظ سے بھی دنیا کے ممالک میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔ آپ نے کہا کہ دنیا کی کوئی قوم آرٹ کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی ۔۔۔۔ آپ نے مزید کہا کہ توقع ہے کہ پاکستان کے وزیر خزانہ اس نئی اکیڈمی کے صدر ہوں گے۔ مادام آزوری نے کہا کہ دُنیا کے تمام ممالک میں آرٹ کی ترقی کے لیے ان کے اپنے قومی تھیٹر ہیں، لیکن پاکستان میں کوئی تھیٹر نہیں۔ پاکستان کو ان تھیٹروں کی بہت ضرورت ہے۔"

ان اعلانات میں بار بار آرٹ کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے ناظرین کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اس طائفہ کی اصطلاح میں آرٹ سے مراد ناچ اور گانا ہے۔ نیز ان اعلانات میں جس آرٹ اکیڈمی کے قیام کی بشارت دی گئی ہے اس کے باضابطہ قیام کا اشتہار بھی آزوری صاحبہ کے رقص کی تصویر کے ساتھ ۹ فروری ۱۹۵۰ء کے ڈیلی ڈان کراچی میں شائع ہو چکا ہے۔ اور اس اشتہار پر زیر سرپرستی آنریبل مسٹر غلام محمد وزیر مال کے الفاظ بھی اہل پاکستان کی آنکھیں روشن کرنے کے لیے ثبت ہیں۔ یہاں ایک مرتبہ پھر پلٹ کر مسٹر غلام محمد کی اس تقریر کو پڑھ ڈالیے جو انھوں نے اسلامی اقتصادی کانفرنس میں کی تھی، یہ ہے عمر بھر کے مطالعۂ اسلام کا نچوڑ۔

زنانہ نیشنل گارڈز:

پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کو جو اہمیت دی جا رہی اور اس کی پریڈوں اور سلامیوں سے اس ملک کے اربابِ اقتدار اور لیڈر صاحبان کو جس درجہ دلچسپی ہے

اس کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ اس وقت دفاعی نقطۂ نظر سے ایک نمبر کی اہمیت ہمارے ملک میں اگر کسی چیز کو حاصل ہے تو اسی چیز کو حاصل ہے۔ ہماری قیادتِ عُلیا کے ارکان اپنے معروف پروگراموں میں اور کسی چیز کے لیے وقت نکال سکیں یا نہ نکال سکیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ زنانہ نیشنل گارڈز کی پریڈوں اور سلامیوں کو قضا ہونے دیں۔ یہ پریڈیں اور سلامیاں جن اسلامی آداب و قواعد کے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتی ہیں اس کے متعلق چند رپورٹیں ملاحظہ ہوں:

"قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کی طرف سے ڈھاکہ سپورٹس ایسوسی ایشن کے وسیع میدان میں قواعد، کھیل اور رسہ کشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ صوبہ کے گورنر سر فریڈرک بورن نے زنانہ نیشنل گارڈز کی سلامی قبول کی اور انعامات تقسیم کیے۔ نیشنل گارڈز کی جماعت میں شہر کے بعض مقتدر حضرات کی بیگمات اور کالج کی طالبات شریک ہیں اور باوجود روزمرہ کی مصروفیات کے یہ خواتین اس قومی ادارہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے قیام کی پہلی سالگرہ کے موقع پر نہ صرف ڈھاکہ، بلکہ دوسرے اضلاع کی خواتین بھی سپورٹس میں شریک ہوئیں۔ پنجاب رجمنٹ کے بینڈ کے ہمراہ سفید وردیوں اور سبز پیٹیوں میں ملبوس خواتین نے مارچ پاسٹ کی رسم ادا کی۔ اس کے بعد سوگز کی دوڑ، لانگ جمپ (لمبی چھلانگ)، رسہ کشی اور دوسرے کھیلوں کے مظاہرے کیے گئے۔ اس موقع پر ہندوستان کے ہائی کمشنر مسٹر سنتوش کمار باسو، میجر جنرل یعقوب خاں اور دوسرے اعلیٰ فوجی اور سول افسران بھی موجود تھے۔"[1]

پچھلے دنوں اس زنانہ نیشنل گارڈز کے ایک دستہ کو مکہ اور مدینہ کی سندِ تصدیق

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء

بھی حاصل ہو گئی۔ سعودی عرب کے جو نمائندے بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے انہوں نے ایک چاق و چوبند دستہ کی پریڈ دیکھی اور نہ صرف اس کی تحسین فرمائی بلکہ یہ امید ظاہر کی کہ سعودی عرب کی خواتین بھی اس اُسوۂ حسنہ کی پیروی کریں گی۔ پاکستان کے مسلمان جو مکہ اور مدینہ کے فتووں کو ہمیشہ آخری دینی سند کی حیثیت دیتے رہے ہیں علم بردارانِ کتاب و سنت کے اس فتوے کے بعد بھلا اب کسی کو زنانہ نیشنل گارڈز کے کسی پہلو پر نکتہ چینی کے لیے کاہے کو لب ہلانے کی اجازت دیں گے۔ اصل خبر بالفاظہا ملاحظہ ہو:

"کراچی ۹۔ دسمبر! آج کراچی میں پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کے ایک چاق و چوبند دستے نے پریڈ کی۔ بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شریک ہونے والے سعودی عرب کے ارکانِ وفد اور پاکستان میں سعودی عرب کے مدارالمہام نے پریڈ کی سلامی لی۔ سعودی عرب کے وفد کے لیڈر نے اس تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی خواتین قومی زندگی میں مردوں کے دوش بدوش جس طرح کام کر رہی ہیں ان شاء اللہ سعودی عرب کی عورتیں بھی اپنے فرائض اسی تندہی سے انجام دیں گی۔"[1]

اس زنانہ نیشنل گارڈز کی تمام تربیت مرد فوجی افسروں کے سپرد ہے اور وہ ان دستوں کی تربیت جن شرعی و اخلاقی ذمہ داریوں کے ساتھ کر رہے ہیں اور اس کے جو نتائج سامنے آ رہے ہیں اس کے متعلق ایک واقفِ حال کی شہادت ملاحظہ ہو۔ ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے اپنی ۲۳۔ اپریل ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں اپنے ایک مراسلہ نگار حقیقت پسند کا مندرجہ ذیل مراسلہ شائع کیا ہے:

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور: ۱۱ دسمبر ۱۹۴۹ء

"جناب من! پیشتر اس کے کہ آپ تبلیوں اور پردے کی بحث ختم کریں کیا آپ ایک حقیقت پسند شخص کو بھی اپنے احساسات پیش کرنے کا موقع دیں گے۔

فوج سے متعلق اپنے ۳۰ سالہ تجربہ کی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ فوج کے صرف وہ افسر عورتوں کے آوارہ پھرنے کے حق میں ہیں جو محض جنگی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ .... یہ لوگ نوجوان ہیں اور عورتوں کی یہ آزادی اس لیے چاہتے ہیں تاکہ جہاں موقع میسر آئے یہ عورتیں ان کی تفریح کا سامان بن سکیں۔ ان کے ہاں کھانے کی میزوں پر سب سے زیادہ پردہ ہی بحث کا موضوع ہوتا ہے اور یہ لوگ تصویر کا دوسرا رُخ کبھی دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

میں کیپٹن ظفراللہ اور اُن کے ہم خیال لوگوں کی توجہ انہی دنوں کی صرف اس خبر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس میں ان زنانہ نیشنل گارڈوں کا ذکر تھا جن کا معاملہ نرسنگ اور دوسرے ڈاکٹری شعبوں میں بھرتی کے لیے زیرِ غور تھا اور اس سلسلہ میں اُن کے ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت پیش آئی۔ اس ڈاکٹری معائنہ کا خوفناک نتیجہ بیان کرنے سے میں دانستہ احتراز کرتا ہوں۔ یہی ایک بات ہمارے سمجھ دار دوستوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے[1]۔ آخر اس کی وجہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

حقیقت پسند۔ لاہور"

اگر آپ یہ اندازہ کرنا چاہیں کہ رفاہِ ملکی اور نیکی و خیرات کے خشک و بے مزہ اور کڑوے کسیلے کاموں کو ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈز نے کس قدر لذیذ اور پُرکشش بنا

---

[1] مضمون نگار صاحب کی یہ سادہ مزاجی قابلِ داد ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح کے خوفناک نتائج ان حضرات کی آنکھیں کھولنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ یہ مبارک نتائج برآمد ہوں اور ان میں زیادہ سے زیادہ حصہ خود ان کا ہو۔

دیا ہے تو اس کے لیے اس کی تیسویں بٹالین کے اس تفریحی پروگرام کی روداد ملاحظہ فرمائیے جو کوکڈک ہال میں زیر سرپرستی بیگم لیاقت علی خاں ۲۷، ۲۸ اور ۲۹۔اگست کی تاریخوں میں منعقد ہوا۔ یہ روداد ڈیلی 'ڈان' میں اس کے نامہ نگار کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ نامہ نگار لکھتا ہے :

"پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کا تیسواں بریگیڈ گذشتہ تین روز سے ایک نایاب نظارۂ جمال فراہم کر رہا ہے۔ لوگ جب کسی نیک مقصد میں مدد کے لیے خیراتی فنڈ کا کوئی تماشہ دیکھنے جاتے ہیں تو ٹکٹ خریدتے ہوئے عموماً وہ کسی اونچے معیار کی توقع نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ پُرمسرت اور تعجب انگیز امر تھا جب انہوں نے دیکھا کہ موسیقی، رنگ اور زرّیں ملبوسات کا ایک طوفان اُن پر اُمنڈ پڑا....... تماشہ کی ابتدا سازندوں کے ایک طائفہ نے کی۔ نرخیز، خوش جمال اور خوش پوشاک لڑکیاں ستار، اسراج، وائلن اور بانسری پورے کمالِ فن کے ساتھ بجا رہی تھیں۔ یہ انبوہِ جمال و موسیقی دیکھنے والوں اور سننے والوں کے لیے جنت نگاہ اور فردوس گوش تھا۔ پھر چھ مہوش لڑکیوں نے فصلی ناچ شروع کیا۔ یہ ناچ حسن و شباب اور مسرت و انبساط کا پورا پورا مظاہرہ تھا۔ منی پُوری ناچ تو کمالِ فن کا ایک نادر نمونہ تھا جو ایسے تفریحی تماشوں میں دیکھنے کا کم ہی اتفاق ہوتا ہے۔ مصری ناچ اپنی خصوصیات کے مطابق حرکاتی تیزی اور نغماتی ہم آہنگی کا ایک دلکش مرقع تھا۔ پھر پنجاب کا مشہور دیہاتی ناچ لُڈّی تو بس طوفانِ نغمہ و رنگ تھا۔ سٹیج پر مسز نذیر احمد کا نغمۂ تنہائی اور اس پر رنگ برنگ روشنیوں کا بہاؤ آواز کے جادو کو دوبالا کر رہا تھا۔ پردوں کے پس منظر میں غالب کی غزل سے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

ایسے دلآویز انداز میں گائی جا رہی تھی کہ دل کے تاروں کو مرتعش کیے دیتی تھی ....
رنگ و لباس اس تفریحی تماشہ کی دو بڑی خصوصیتیں تھیں۔ ان خصوصیتوں کا مظاہرہ سوزن کاری کی فیلشن پریڈ کے ذریعہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے مختلف قسم کے ملبوسات، آب و تاب، ریشمی چمک اور جواہراتی دمک کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ دہلوی بیگمات اپنی ناممکن التقلید خصوصیات کے ساتھ، حیدرآبادی بیگم آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے پرشکوہ لباس میں، لکھنوی بیگم اپنے مخصوص نازوادا کے ساتھ جو واجد علی شاہی دربار کا طرۂ امتیاز تھا، رامپوری بیگم اپنے دل رُبا انداز، نئی پاکستانی خاتون قدامت کے رچاؤ کے ساتھ نئی تیزی اور نفاست لیے ہوئے، میمن اور سورتی بیگمات اپنے دل آویز کاڑھے ہوئے ملبوسات کے ساتھ سٹیج کے آرپار متحرک ہو کر ایک ہوش رُبا منظر پیش کر رہی تھیں۔
تماشہ کا اختتام درجن بھر عورتوں کی دلفریب قوالی سے کیا گیا۔ نہ صرف یہ کہ موسیقی اور نغمہ کسی بہتر سے بہتر قوالی کے معیار کا تھا، بلکہ ان پُرفن عورتوں نے تو اپنے پُرسحر نازو ادا سے قوالی میں کمال ہی کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کامیابی میں ان کے حُسن و لباس کو بہت کچھ دخل تھا۔
نغمہ و رقص سے مرکب چار سین کا ایک پُر مذاق ڈراما بھی پیش کیا گیا جس کا نام 'جیت' تھا۔ یہ ایک مسلمان رئیس کے گھر کا نقشہ پیش کرتا تھا......
بیرونی مسرت و انبساط کی تصویر تھی۔ مذاق اور شوخی و شرارت سے بھری ہوئی اداکاری اور فنکاری کا مرقع۔ تینوں منگیتر نہایت زور آور نوجوان تھے، لیکن جیتنے والا حمید تو واقعی فاتح تھا......
بیگم لیاقت علی خاں دلی مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے کمال مہربانی سے سرپرستی فرما کر اس تماشہ کو پیش کرنے کی ہمت افزائی فرمائی۔ یہ صرف اُنہی

کی پرتجسس نگاہیں تھیں جنہوں نے بہت سے پوشیدہ جواہرات کو ڈھونڈ نکالا۔
آرٹ اور اُس کے متعلقات سے اُن کی دلچسپی نے ہماری معاشرت میں آرٹ
اور موسیقی کو دوبارہ زندگی بخشی ہے۔
یہ تماشا کہاں تک پسند کیا گیا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ تماشا
کے دوران میں قریب قریب ہر چیئر کش پر ریلیف فنڈ کے لیے عطیات کے
اعلان ہوتے رہے۔[1]"

یہ ہے ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈز کی تصویر جس کو اس وقت پاکستان کی دفاعی تیاریوں میں ایک نمبر کی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہے ہماری وہ فوج ظفر موج جس کے لیے قرآن و حدیث سے دلیلیں فراہم کی گئی ہیں کہ مسلمان خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جنگی کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔ یہ ہیں وہ طریقے جن میں ماہر ہو جانے کے بعد ہماری بہنیں اور بیٹیاں دشمنوں کے چھکے چھڑا دیں گی اور یہ ہیں وہ اسلامی طریقے جن سے ہماری قوم کا جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ ابھرتا ہے اور جن سے کام لے کر وہ اپنے جہاد کے لیے روپے فراہم کرتی ہے۔

زنانہ کالجوں کا رنگ:

ہمارے زنانہ کالجوں میں لڑکیوں کو جس طرح اسلامیت کے رنگ میں رنگا جارہا ہے اس کے ثبوت میں صرف فاطمہ جناح میڈیکل کالج، لاہور کا حوالہ دے دینا شاید کافی ہوگا۔ اخباروں میں آئے دن اس کالج سے متعلق ایسی تصویریں چھپتی رہتی ہیں جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے وزرائے عظام یا حکام عالی مقام میں سے کوئی بزرگ نہایت

---

[1] ڈیلی ڈان۔ کراچی: ۳۰۔ اگست ۱۹۴۸ء

سان سے براجمان ہیں اور ان کے ارد گرد کالج کی طالبات اور معلمات اس طرح جمع ہیں جس طرح شمع کے گرد پروانے جمع ہوں۔

لاہور کا اسلامیہ کالج فار ویمن ایک باپردہ کالج ہونے کے لحاظ سے مشہور رہا ہے، اب ہمارے ارباب کار اس کو جو شکل دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا اندازہ ذیل کے مراسلہ سے فرمائیے جو ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور کی ۲۰۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ایک طالبہ کا باپ اخبارِ مذکور کے ایڈیٹر کو لکھتا ہے:

"جناب من!

زنانہ اسلامیہ کالج۔ لاہور خالصتہً باپردہ ادارہ ہے اور اس بنا پر اسے مسلمانوں سے عطیات اور امدادی وخیراتی رقوم حاصل ہوتی رہی ہیں۔ مگر آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کالج میں ایسے مرد اور ان کے دوست احباب آتے ہیں جن کا اس ادارے سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جب ایسے لوگ کالج میں آتے ہیں اور یہ وقتاً فوقتاً آتے ہی رہتے ہیں تو لڑکیوں کو کھلا ننگے سر اور بے نقاب رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ میں ایک طالبہ کے والد کی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اب یہ کالج باپردہ نہیں رہا؟ اگر نہیں رہا تو پبلک کو اس سے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا؟[1]

ایم۔ اے۔ مجید قریشی۔ لاہور"

مخلوط کالجوں کا حال:

لڑکوں اور لڑکیوں کے مخلوط کالجوں اور سکولوں کے متعلق ہر نیک دل مسلمان کو یہ گمان

---

[1] نامہ نگار صاحب سے گزارش ہے کہ جب پبلک اتنی اندھی ہو جائے کہ دن دہاڑے اور ڈنکے کی چوٹ علی الاعلان جو کچھ کیا جا رہا ہے اسے نظر نہ آئے تو آخر اسے آگاہ کیوں نہ بنایا جائے۔ وہ تو اپنے سامنے دنیا بے وقوفوں کی بستی ہے (THE WORLD IS FULL OF FOOLS) کا قاعدہ کلیہ رکھ کر چل رہے ہیں اور ان کا اب تک کا تجربہ اسی قاعدہ کی تصدیق کرتا ہے۔

تھا کہ تہذیب شیطانی کی یہ لعنت کبریٰ پاکستان بننے کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کی جائے گی۔ لیکن اوپر بیگم لیاقت علی خاں کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں کہ آزادیٔ نسواں اور پردہ شکنی کے لیے جو جہاد انہوں نے شروع کر رکھا ہے اس میں اپنی ساری کامیابی کا انحصار وہ انہی کالجوں پر سمجھتی ہیں۔ انہی کالجوں کے اندر، اُن کے خیال میں، اُس فوج ظفر موج کے افسر اور کمانڈر تیار ہو رہے ہیں جو اس ملک میں اس خالص اسلامی تہذیب کو قائم کرے گی جس کے لیے بیگم صاحبہ میلاد کی مجلسوں میں والہانہ انداز میں تقریریں فرمایا کرتی ہیں اور جس کے قائم کرنے کے لیے ہی اُن کے محترم شوہر نے پاکستان دستور ساز اسمبلی میں مشہور قرار دادِ مقاصد پاس کرائی ہے۔

ان کالجوں میں پڑھنے والیوں اور پڑھنے والوں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ ایک واقعہ یاد آگیا ہے جس کو ہم محض اس خیال سے یہاں ذکر کرتے ہیں کہ اس سے فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ موجودہ تعلیم کس ٹائپ کے اشخاص تیار کرتی ہے اور کس ذہنیت اور کس مذاق کے لوگ ہیں جن کو اس نظامِ تعلیم میں یہ درجہ بخشا گیا ہے کہ وہ ہماری نوجوان نسل کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مکتب میں بٹھا کر تعلیم دے رہے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس سے اخلاق بگڑتے نہیں بلکہ بن رہے ہیں۔

غالباً اپریل ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور ان کے بعض رفقاء کو پاکستان کے ایک کالج میں تقریر کے لیے دعوت دی گئی جو لڑکوں اور لڑکیوں کا مخلوط کالج تھا۔ مہمان کی تقریر سننے کے لیے ہال میں جس طرح طلبہ جمع ہوئے اسی طرح طالبات بھی جمع ہوئیں اور تہذیب جدید کے آداب کے مطابق لڑکیاں ہال کی اگلی بنچوں پر بیٹھیں اور ایک آدھ کے سوا سب بہنیں بے نقاب تھیں۔ جب حاضرین اور مہمان اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو کالج کے پرنسپل صاحب معزز مہمان کے خیر مقدم اور حاضرین سے

اُن کے تعارف کے لیے کھڑے ہوئے اور اپنی فصیح و بلیغ تقریر کا آغاز انہوں نے ایک مصرعہ سے فرمایا جس کو اپنے ادبی ذوق اور اپنی اخلاقی حِس دونوں پر انتہائی ظلم کرکے، میں محض اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ ناظرین اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔ مصرعہ یہ تھا: ؎

خُدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

پرنسپل صاحب نے یہ مصرعہ اس بے تکلفی سے پڑھ دیا گویا خطبۂ مسنونہ تلاوت فرما رہے ہیں اور دوسروں کا تو پتہ نہیں مگر میرا جو حال ہوا اس کا اندازہ اس سے فرمایئے کہ باوجودیکہ اب اس واقعہ پر ایک مدت گزر چکی ہے لیکن آج بھی اگر اس اجتماع اور اس مصرعہ کا خیال آجاتا ہے تو مجھے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ گویا اس مصرعہ کے پڑھنے کا جرم پرنسپل صاحب سے نہیں بلکہ مجھ سے ہی صادر ہوا تھا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے مقصود کسی خاص کالج اور اس کے پرنسپل صاحب کو زیرِ بحث لانا نہیں ہے، بلکہ مقصود محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن مخلوط کالجوں کی نسبت بیگم لیاقت علی خاں صاحب اور ہمارے اربابِ کار کو یہ گمان ہے کہ اُن کے اندر اس ملک میں آئندہ قائم ہونے والی تہذیب کے نمونے ڈھالے جا رہے ہیں اُن کے طلبہ اور طالبات تو الگ رہے اُن کے پرنسپلوں تک کے مذاقِ سلیم کا یہ حال ہے کہ ان کی صحبت سے ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو پرہیز کرنا واجب ہے۔

ڈرامے اور مینا بازار:

آزادیٔ نسواں اور پردہ شکنی کی اس تحریک ہی کو مقبول بنانے کے لیے ڈراموں، ناچ گانے کی مجلسوں اور مینا بازاروں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے جس کی ہر دلعزیزی اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید پاکستان میں تہذیب و ثقافت

نام ہی ان چند چیزوں کا رہ جائے گا۔ ڈراموں میں بیشتر زنانہ نیشنل گارڈز، کالجوں کی طالبات اور سرکاری اداروں کی پناہ گزیں لڑکیاں حصّہ لیتی ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس 'آرٹ' کو فروغ دینے کے لیے ہمارے اندر سے ایک مستقل طبقہ اس تحریک کے کارکنوں کے ہاتھ آگیا ہے جو عجب نہیں کہ بگڑتے بگڑتے ایک دن اس کو پیشہ ہی بنا بیٹھے

مینا بازار پاکستان میں بیگم لیاقت علی خاں صاحب کی اوّلیات میں سے ہے۔ انہی نے کراچی میں اس کا آغاز فرمایا اور اب یہ حال ہے کہ پاکستان میں قومی و ملّی مقاصد کے لیے روپے اکٹھے کرنے کا اس کو واحد کامیاب ذریعہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں کراچی کے مینا بازار کی تقلید کی جا چکی ہے اور جو شہر باقی رہ گئے ہیں وہ بھی جلد از جلد اس اسوۂ حسنہ کی پیروی سے سعادت اندوز ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ مینا بازار ظاہر میں تو اس غرض کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں کہ ان سے قومی اغراض کے لیے روپیہ اکٹھا کیا جائے، لیکن درحقیقت اُن کا مقصد عورتوں کو اس آزادی و بے قیدی کی چاٹ لگانا ہے جو اس ملک کے اربابِ اقتدار یہاں پھیلانے کے دل سے خواہشمند ہیں[1] چنانچہ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر یہاں مینا بازار کی ایک خاص قسم رائج کی گئی ہے جو پردہ شکنی کی تحریک اور جنسی جذبات کو بھڑکانے میں خاص طور پر معین ہے۔ اور چونکہ جنسی جذبہ کی زود اشتعالی اور اثر انگیزی معلوم ہے اور اُس کے ذریعہ سے بڑی آسانی کے ساتھ عوام کی بھیڑیں اکٹھی کی جا سکتی ہیں، اس لیے اس نسخہ کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ کوئی نہیں

---

[1] اس کا اندازہ کرنے کے لیے ناظرین کو ۲۰۔ مارچ ۱۹۴۹ء کے ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور میں کراچی کے مینا بازار میں صرف بیگم لیاقت علی خاں صاحب اور ملک غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان کی ملاقات کی ایک تصویر دیکھ لینا کافی ہو گا۔

سوچا کہ قوم کو اگر ایک آزاد اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہے تو اس کو ایسی تربیت دینے کی ضرورت ہے کہ اُس کے اعلیٰ قومی اور مذہبی جذبات بیدار ہوں اور تمام پیشِ نظر مہمات میں وہی جذبات اس کی رہنمائی کریں۔ اگر ہر کام ناچ گانے کی مجلسوں، ڈراموں اور مینا بازاروں ہی کے واسطہ سے لیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ایک جنسی جذبہ کے سوا اس قوم کے دوسرے سارے جذبات بالکل مردہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ اگر آپ کوئی مسجد بنانے کے لیے بھی اس سے چندہ مانگیں گے تو اس وقت تک وہ آپ کو ایک حبہ نہیں دینے کی، جب تک آپ پہلے اس کو مینا بازار کی سیر نہ کرائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں یہ ذوق روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے اور مینا بازاروں کی نت نئی قسمیں ایجاد ہوتی جا رہی ہیں۔

۱۲۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک مینا بازار سیالکوٹ میں لگایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح پاکستان کے کمانڈر انچیف سر ڈگلس گریسی نے فرمایا۔ اس کے پروگرام میں ایک دن عورتوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس خاص دن کے متعلق ایک خاتون کا بیان ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے عینی مشاہدہ کے بعد اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع کرایا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ پاکستان میں مینا بازاروں کا مقصد کیا ہے۔ خاتون مذکور لکھتی ہیں:

"جناب من!

سیالکوٹ چھاؤنی میں جو مینا بازار لگایا گیا تھا اس کے متعلق یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا دوسرا دن عورتوں کے لیے خاص ہوگا۔ میں یہ اعلان ہی سن کر حیران رہ گئی کیونکہ مینا بازار تو کہتے ہی اُس بازار کو ہیں جو عورتیں عورتوں کے لیے لگائیں۔ لیکن جب میں اُس بازار میں گئی تو وہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ وہاں کی ہر چیز کو اپنی توقعات کے بالکل برعکس پایا۔ تقریباً سبھی دکانوں اور سٹالوں کو مرد ہی چلا رہے

تھے۔ اس احاطہ میں سب سے نمایاں چھ پولیس آفیسر تھے جو اس نمائش کے وسط میں براجمان تھے۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز وہ چار جی۔ ایم۔ پی کے آدمی تھے جو ہر طرف پھر رہے تھے۔ تقریباً سو آدمی مختلف ٹولیوں میں ہر طرف گشت لگا رہے تھے۔ بیگم بشیر۔ سیالکوٹ[1]"

بیرونی ممالک میں ہماری خواتین کا تعارف:

آزادیٔ نسواں کی یہ تحریک اب اندرونِ ملک ہی تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اس کی منادی دوسرے ممالک میں بھی شروع ہو گئی ہے۔ آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی ششماہی رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی خواتین نے بیرونی ممالک سے اپنے تعلقات جس قدر وسیع کر لیے ہیں خود حکومت پاکستان بھی اپنے تعلقات اب تک اس قدر وسیع نہیں کر سکی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وہ اخبارات بھی جو اس تحریک کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش ہیں اس وسعتِ تعلقات کو دیکھ کر گھبرا اٹھے ہیں اور وہ عورتوں کو مشورہ دینے لگے ہیں کہ وہ اپنی سرگرمیاں اندرونِ ملک ہی تک محدود رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ بیرونی ممالک میں ہماری اسلامی حکومت کی خواتین جس پہلو سے متعارف ہو رہی ہیں اس کو واضح کرنے کے لیے ہم یہاں اس وفد کی کارگزاری پیش کرتے ہیں جو آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی طرف سے امریکہ میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی زنانہ نمائش میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ جہاں ہر مذہب و ملت کی خواتین نے اپنی اپنی تہذیب و روایات کی نمائش کی وہاں ایک خالص اسلامی حکومت کی نمائندہ خواتین نے اسلامی تہذیب و روایات کے کیا نمونے دکھائے:

---

[1] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور: ۱۹۔ دسمبر ۱۹۴۹ء

"بین الاقوامی زنانہ نمائش کا چھبیسواں سالانہ اجلاس جو ۲۰ نومبر ۱۹۴۹ء کو نیویارک میں شروع ہوا، اس میں پاکستان کی نمائندگی بیگم حسین ملک (قائد وفد) بیگم نذیر احمد اور مسز پرانڈ نے کی ...... شام کو پاکستانی وفد (بیگمات مذکورہ) نے حاضرین کی تواضع کے لیے ایک دلچسپ پروگرام پیش کیا..... بیگم حسین ملک نے جنہوں نے اس پروگرام کا افتتاح کیا، پاکستانی عورتوں کی طرف سے امریکن عورتوں کو خیرسگالی کا پیغام پہنچایا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستانی عورتیں کو تعمیر ترقی کے کاموں میں عملاً شریک کرنے کے لیے ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ..... پردہ کے نفاذ سے عورتوں کو ان کے سیاسی اور شہری حقوق سے محروم کرنا مقصود نہیں تھا[1]۔ بہرحال اب پردہ پاکستان سے بڑی تیزی سے رخصت ہو رہا ہے۔ بیگم حسین ملک کے بعد بیگم نذیر احمد نے حاضرین کو پاکستانی گیت سے محظوظ کیا۔ پروگرام کے آخر میں مشہور عالم رقاصہ زہرہ اور اس کے ساتھی نے منفوں کا رقص پیش کیا[2]۔

اس پروگرام میں ہمارے سفارت خانہ کے افسروں، ان کے متعلقین، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شریک ہونے والے پاکستانی وفد کے اراکین اور امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد شریک تھی[3]۔"

۱۔ بیگم صاحبہ نے یہ معذرت۔ نیابتاً اسلام کی طرف سے پیش کی ہے جس کے لیے وہ مسلمانوں کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہیں۔

۲۔ انصاف کے ساتھ فرمائیے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ قائم ہوا ہوتا تو اس عظیم الشان اسلامی ورثہ کا محافظ کون ہوتا اور امریکہ جیسے دُور دراز کفرستان میں آج اس کا مظاہرہ کر کے اسلام کا بول بالا کون کرتا!

۳۔ ڈیلی ڈان۔ کراچی : ۲۳-۲۴ نومبر ۱۹۴۹ء

پاکستانی خواتین کی ترقی پر نیویارک کے کرسچین سائنس مانیٹر میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جو 'ڈان' نے نقل کیا ہے۔ ہم اس کا ضروری اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں۔ اس سے بھی اندازہ ہو سکے گا کہ باہر کی دنیا میں پاکستانی خواتین کے حال اور مستقبل کو کس نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور کس عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے:

"نیویارک، ۲۰ دسمبر! پاکستانی خواتین برابر ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ رہی ہیں... ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی آزاد قومی زندگی ہر حرم کے اندرونی گوشوں تک پہنچ گئی۔ بہت سی (پردہ نشین) عورتوں نے بھی آزادی کا مطالبہ کیا اور یک لخت ان میں سے سینکڑوں دبلے زرد ڈھانچے لیے ہوئے پناہ گزینوں کی مدد کے لیے گھروں سے باہر نکل آئیں.... بیگم رعنا لیاقت علی خاں — وزیراعظم پاکستان کی نرم و نازک، زندہ دل، حسین[1] بیوی — نہایت ہوشیاری کے ساتھ پردہ کو سرے سے اڑا دینے کے خواہاں اور اس کے دقیانوسی حامی گروہوں کے بین بین راستہ اختیار کر رہی ہیں.... حال ہی میں صوبہ سرحد میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ پاکستانی گورنر کو خوش آمدید کہنے کے لیے سینکڑوں پٹھان عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں"[2]

---

[1] قرآن نے جن خواتین کو مسلمان عورتوں کی رہنمائی پر مقرر کیا ان کے اوصاف سورۂ احزاب میں یہ گنائے ہیں: مسلمات (خدا کی فرمانبردار)، مومنات (خدا پر ایمان رکھنے والیاں)، قانتات (مطیع)، صادقات (راست باز)، صابرات (ثابت قدم)، خاشعات (خدا ترس)، متصدقات (صدقہ دینے والیاں)، صائمات (روزہ رکھنے والیاں)، حافظات (اپنے ناموس کی حفاظت کرنے والیاں)، ذاکرات (اللہ کو یاد رکھنے والیاں)۔ (الاحزاب - ۳۳ : ۳۵) مگر یہ اوصاف تو بقول 'مارننگ' دقیانوسی قیادت کے ہیں۔ نئی قیادت جن محاسن سے مستفیض ہو کر میدان میں آئی ہے وہ نرمی و نزاکت، زندہ دلی اور حسن ہے — ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!

[2] ڈیلی ڈان، کراچی: ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء

شاہِ ایران کے ساتھ جو ایرانی اخبار نویس پاکستان آئے تھے انہوں نے واپس جا کر اپنے اخبارات میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان کا ایک نمونہ مسٹر ممتاز احمد خاں صاحب جو شاہ کے ہمراہ تہران گئے تھے، کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

ممتاز احمد خاں صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"..... ایرانی اخبار نویسوں نے جو شاہ ایران کے ساتھ پاکستان آئے تھے، واپس جا کر پاکستان پر ہر پہلو سے بہت ہی ہوش رُبا مضامین لکھے اور ان میں پاکستان کی فوج سے لے کر سازندوں اور عزاروں تک ہر شے کا ذکر کیا۔

ہفت روزہ "ترقی" کے ایڈیٹر آقائے لطف اللہ صاحب نے لاہور پر ایک مضمون لکھا جس میں پاکستانی عورتوں کی دولتِ حُسن کو، جو ملک کے ہر حصے سے اس خوبصورت رُومانی شہر میں جمع کی گئی تھی، بہت نمایاں کر کے بیان کیا۔ اپنے اس مضمون میں انہوں نے 'حُسنِ نمکینِ ہندی' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ایران کے قدیم شاعروں، مصنفوں اور سیاحوں نے ہندی لڑکیوں کی غزال چشمی کے جو نقشے کھینچے ہیں آج کا لاہور اس کا ہو بہو نقشہ پیش کرتا ہے .....

یہ مضامین دکانوں، ہوٹلوں، بازاروں اور گھروں میں ہر جگہ خوب مزے لے لے کر اور شوق سے پڑھے گئے[1]"

زہرآلود تحریریں :

اس تحریک کو جلدی سے جلدی کامیاب بنا دینے کے لیے جس قسم کا لٹریچر دن رات فراہم ہو رہا ہے اور وہ جس طرح بے روک ٹوک اخبارات و رسائل کے ذریعہ سے

1۔ ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور : ۱۰۴ اپریل ۱۹۵۰ء

گھر گھر پہنچ رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی پوری تفصیل پیش کرنا سردست میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ تاہم چند مراسلات کے نمونے نذرِ ناظرین ہیں۔ ان سے آپ اندازہ فرما سکیں گے کہ ہماری اس اسلامی حکومت کے ارکان جو اپنی ذات پر معمولی سے معمولی تنقید بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اگر کوئی اخبار یا رسالہ بھول کر بھی ان کی شان میں ایک حرف نکتہ چینی کی قسم کا لکھ دیتا ہے تو فوراً چراغ پا ہو جاتے ہیں اور اس "غدار" کی سیفٹی ایکٹ سے خبر لے ڈالتے ہیں۔ وہ کتنے رواداراور فیاض و حریت نواز واقع ہوئے ہیں اس قسم کی تحریروں کے لیے جو ان کے اس محبوب مقصد 'آزادیٔ نسواں' کو تقویت پہنچائیں اگرچہ ان میں خاندانِ رسالت اور صحابہ وصحابیات[1] کی کھلی ہوئی توہین کی گئی ہو، اگرچہ ان میں ہمارے تمام اسلاف صالحین کو بداخلاق ٹھہرایا گیا ہو، اور اگرچہ ان کے ایک ایک حرف سے اسلام کے خلاف غصہ اور نفرت کی بدبو پھوٹ رہی ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

راولپنڈی کے کوئی بزرگ کیپٹن ظفراللہ پوستی ہیں۔ ان کا ایک مراسلہ جو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو:

"جنابِ من!

مس جیبی نے میرے خط کا جو جواب دیا ہے اس نے اس قیدی کی یاد تازہ کر دی ہے جو مدتوں قید رہنے کی وجہ سے اس کوٹھڑی ہی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے جس میں وہ بند رکھا گیا ہے۔

ہاں میں جانتا ہوں کہ پیغمبرؐ کی بیٹی فاطمہؓ پردہ کرتی تھیں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قائداعظم کی بہن فاطمہ ایسا نہیں کرتی اور یہی (مؤخرالذکر فاطمہ کا) طریقہ صحیح ہے۔ کیونکہ ہمارا ملک دوسرا ہے، ہماری دنیا دوسری ہے، ہمارے حالات

---

[1] یہ تقابل ملاحظہ ہو مس فاطمہ جناح کا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تمام خواتین جنت

دوسرے ہیں اور یہ سب کچھ اس سے مختلف ہے جو تیرہ سو سال پہلے تھا۔

یہ بالکل بے تکی بات ہے کہ ہر معاملہ میں قدیم زمانے سے جواز تلاش کرنے کا رجحان صرف

احمقانہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس کا نتیجہ سماجی جمود اور ذہنی پستی ہوگا۔

کی سردار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں اور جن کی زندگی تمام خواتینِ امت کے لیے اسوہ اور جن کی محبت لازمۂ ایمان قرار دی گئی ہے۔ پھر یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس تقابل میں مس فاطمہ جناح کے طریقِ زندگی کو اہلِ بیت رسالت کے اسوۂ حسنہ پر کھلم کھلا ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن ہماری اسلامی حکومت کے آئمہ میں سے کسی کی غیرت بھی اس پر حرکت میں نہ آئی۔ پچھلے دنوں کسی اخبار کی محض اس اطلاع پر کہ امریکہ کی کسی فلم کمپنی کی کسی فلم میں کسی ذہنیت سے حضرت فاطمہؓ کا ذکر آ گیا ہے، پاکستان کے مسلمانوں کی غیرت بھڑک اٹھی تھی، حالانکہ وہ محض افواہ ہی افواہ تھی، اور یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک شخص سیدہ پاک کی کھلی ہوئی توہین و تحقیر کرتا ہے لیکن کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ ہمارے بعض بزرگ مسلمانوں کی اس ادا پر بھی قربان ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنے بزرگوں اور آئمۂ دین کی چاہے کتنی توہین کر ڈالیں مگر کوئی دوسرا ان کے خلاف زبان کھولے تو اس کی جان اور اپنی جان ایک کر کے رہیں۔

۱۔ جب سب کچھ دوسرا ہے تو صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارا دین بھی دوسرا ہے۔ اسلام کا انکار کر کے تم جس وادی میں چاہو بھٹکو اور جس کو چاہو اپنا امام اور ہادی بناؤ کسی مسلمان کو تم سے بحث نہیں ہوگی۔ لیکن مسلمان کہلا کے تمہیں ان کی توہین کرنے کا کیا حق ہے، جن کی محبت اور جن کی پیروی امت کے لیے جزوِ ایمان اور ذریعۂ نجات قرار دی گئی ہے؟

۲۔ آپ کچھ سمجھے کہ یہ ذات شریف کس بات کو "احمقانہ" قرار دے رہے ہیں؟ اس بات کو کہ مسلمان ہر معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ سے سندِ جواز ڈھونڈنے کی کوشش کریں، ہر امر میں خلافتِ راشدہ اور سلفِ صالحین کے تعامل کی دلیل تلاش کریں، ہر قدم اٹھاتے وقت اس بات کی جستجو کریں کہ پیغمبرؐ اور صحابہؓ کی زندگی کی روشنی میں یہ قدم اٹھانا صحیح ہے یا غلط؟ یہ رجحان ان حضرت کے نزدیک "احمقانہ" ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ مراسلہ اس اخبار میں شائع ہوا ہے جو ۱۹۴۹ء کے وسط میں سیفٹی ایکٹ کے تحت تین مہینے کے لیے اس جرم میں بند کیا گیا کہ اس نے کشمیر کے متعلق ایک ایسی افواہ چھاپ دی تھی جس سے ہمارے وزیر اعظم صاحب کے متعلق عوام میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن اسی اخبار نے جب مسلمانوں کے اتباعِ رسولؐ و صحابہؓ کے فعل کو احمقانہ اور خطرناک قرار دیا تو کسی کو اس کی ذرہ برابر پروا نہ ہوئی۔

بہن جیین، سنو! آپ کی جو بہنیں قید سے رہائی پا چکی ہیں ان پر تتلیوں اور بلبلوں کی پھبتی چست کر کے اپنے دل کو اطمینان دلانے کی کوشش نہ کرو۔ اپنے دل کے اندرونی گوشوں میں تم جانتی ہو کہ تتلیاں اُڑ سکتی ہیں اور بلبلیں گا سکتی ہیں مگر تم پنجرے میں بند زرد چڑیا کی مانند رہائی یافتہ ساتھیوں پر حسرت بھری نظر سے تکتی ہوئی محض چوں چوں ہی کر سکتی ہو۔[1]

ایک "صاحب احساس" صاحبہ کا ایک مراسلہ ملاحظہ ہو جو مذکورہ بالا اخبار ہی کی زینت بنا ہے۔ وہ اخبار کے ایڈیٹر کو مخاطب کر کے رقمطراز ہیں:

"جناب من:

اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ روزانہ زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ طریق پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پردہ کے معنی چہرے کو اس طرح چھپانے کے نہیں ہیں جس طرح ہمارے ہاں چھپایا جاتا ہے۔ اصل شے اخلاقی طرز عمل ہے۔ ہم عورتوں پر پردہ ان لوگوں نے ٹھونسا تھا جن کی اخلاقی حالت کافی بلند نہیں تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے اخلاق کو بآسانی بلند نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے عورتوں کو اس ظالمانہ طریقہ سے قید کر دینے کی راہ نکال لی اور وہ سمجھے کہ (اس خرابی پر قابو پانے کا) یہی ٹھیک طریقہ ہے[2]...... اس میں شک نہیں کہ اگر ہم (عورتیں) بھی مردوں کی طرح باہر پھرنے لگیں تو شروع شروع میں ہمیں کچھ تکلیف ہوگی مگر یہ صرف عارضی

---

[1] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ و بور ا ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء

[2] یہ اخلاقی پستی کا الزام "صاحب احساس" صاحبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بلکہ نعوذ باللہ خود اللہ میاں پر بھی عائد کر رہی ہیں کیونکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ پردہ سے متعلق تمام جزئیات و تفصیلات خود قرآن پاک اور حدیث شریف میں بیان ہوئی ہیں اور ہمارے ائمہ و فقہاء میں سے کسی نے بھی اس "تبرج" کو جائز نہیں قرار دیا ہے جس کی حمایت میں موصوفہ تقریر فرما رہی ہیں۔

شے ہوگی۔ جب ہم سب اس کے عادی ہو جائیں گے تو کوئی بھی ضرورت سے زیادہ ہماری طرف متوجہ نہیں[1] ہوگا۔ ہمارے دیہات میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ عورتیں آزادانہ پھرتی ہیں اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں[2]۔ لیکن اس کے باوجود ان کا احترام کیا جاتا ہے اور وہ ٹھیک طرح سے رہتی ہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ شہروں میں بھی یہی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے؟ شہری لوگ تو بہرحال نسبتاً زیادہ ہی پڑھے لکھے اور زیادہ ذمہ داری کا احساس رکھنے والے ہوتے ہیں[3]۔"

اس تحریک کو غذا اور قوت پہنچانے کے لیے اسلامی تاریخ بالخصوص صدرِ اوّل کی تاریخ کو جس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ پاکستان ٹائمز، لاہور کے میگزین سیکشن مورخہ ۴۔اکتوبر ۱۹۴۹ء میں ایک بزرگ اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"پہلا ادبی مرکز جس کا ہماری موجودہ تاریخ پتہ چلا سکی ہے اس کے قائم کرنے کا فخر حضرت سکینہ کو حاصل ہوا جو سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی اور حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں۔ مدینہ میں ان کا خوبصورت محل وقت کے تمام بڑے بڑے بذلہ سنجوں، گویوں، شاعروں اور اہلِ علم کا مرکز تھا۔ یعنی اس زمانہ میں جبکہ بہادرانِ اسلام کی تلواریں

---

[1] جی ہاں، بالکل اسی طرح جس طرح ننگوں کے کلب میں اوّل اوّل کپڑے اتارتے ہوئے تو بڑی شرم محسوس ہوتی ہے مگر کچھ مدت کے بعد کسی مرد و عورت کو یہ احساس تک نہیں رہتا کہ برہنگی کوئی شرمناک چیز ہے۔

[2] 'صاحبِ احساس' خاتون اور ان کے ہم مشرب بزرگوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ اگر ہمارے دیہات میں کوئی عورت ان آزاد منش خواتین کے سے بناؤ سنگار کر کے ان کی سی چال چلتی ہوئی باہر پھرے اور مردوں کے ساتھ اُن کی طرح خلا ملا رکھے تو شاید اسے گاؤں کے غیرت لوگ زندہ بھی نہ رہنے دیں۔

[3] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور: ۳۰۔اپریل ۱۹۴۹ء

سپین اور سندھ کو زیرِ نگیں کرنے میں مصروف تھیں، یہ نامور خاتون وقت کے ذہین طبقہ کے دلوں اور دماغوں پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ یہ ایام اسلامی فتوحات کے ایامِ بہار تھے۔ ایک طرف ملک کے بعد ملک فتح ہو رہے تھے، دوسری طرف اجتماعی اور تہذیبی دائروں کے اندر بھی فتح کے بعد فتح حاصل ہو رہی تھی۔

حضرت سکینہ فیشن میں ہماری سب سے بڑی اور سب سے پہلی لیڈر ہیں۔ وقت کی تمام مجلسی خواتین ان کے طرّہ کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور اس کو طرّۂ سکینہ کہا جاتا تھا۔ وہ موسیقی میں خاص دلچسپی لیتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک غلام سُریج نامی کو اس زمانے کے شہرۂ آفاق گویّے طویس سے تربیت دلائی تھی۔

اس ادبی مرکز کے جواب میں ایک دوسرا ادبی مرکز حجاز کے مشہور صحت افزا مقام طائف میں قائم تھا۔ اس مرکز کی روحِ رواں عائشہ تھیں جو مشہور صحابی حضرت طلحہؓ کی صاحبزادی تھیں۔ ان (عائشہ) کی ماں حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اور امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں جن کے نام ہی پر بھانجی کا یہ نام رکھا گیا تھا۔

اُن کی کھلے بندوں پبلک میں آمدورفت حضرت سکینہ سے بھی زیادہ نمایاں اور جاذبِ نظر تھی۔ ایک مشہور قدیم مؤرخ نے لکھا ہے کہ اُن کے دوسرے شوہر ابن زبیر نے جب اُن کی اس بات پر اعتراض کیا کہ وہ کبھی چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی ہیں تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ: "جب خدائے جمیل نے مجھے اپنے فضل سے حسن و جمال بخشا ہے تو مَیں اُس کے حُسنِ صنعت کو لوگوں کی نگاہوں سے کیوں چھپاؤں، لوگ اس طرح خدا

کی مثالیں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں[1]"

یہ اہلِ بیتِ رسالت اور خاندانِ صدیقِ اکبر کی بہو بیٹیوں کی تصویر کھینچی گئی ہے اور مضمون نگار نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہی اس زمانہ کا عام رنگ تھا۔ اسی طرح عورتیں کھلے بندوں اپنے حسن و جمال کی نمائش کرتی پھرتی تھیں تاکہ لوگ خدا کی صنعت کاری کی نشانیاں دیکھ سکیں۔ جگہ جگہ صحت افزا مقاموں پر نازنینانِ وقت لٹریری سیلون بنا کے بیٹھتی تھیں اور بھانڈ اور گویے اور شعراء اُن کے گرد جمع رہتے تھے۔ وہ فیشن کے نئے نئے نمونے ایجاد کرتی تھیں اور وہ نمونے مقابلہ کے بازاروں میں آتے تھے اور ترجیح و انتخاب کے بعد تمام شہروں میں پھیلتے تھے اور دلدادگانِ حسن و ادا ان کو قبول کرتے تھے۔

اسلامی تاریخ کا وہ دَورِ مبارک جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون سے تعبیر فرمایا ہے ان مضمون نگار صاحب کے نزدیک نسوانی ترقی کی ان تمام "نورانیتوں" سے منور تھا، لیکن بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں رہا اور انہوں نے عورتوں کی اس ترقی کو پیچھے دھکیل دیا۔ چنانچہ اسی مضمون میں مضمون نگار صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ تو بعد کے عباسیوں کے زمانہ میں جب اختلاط شروع ہوا تو عورتوں کی ترقی کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اس زمانہ میں بے حیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ جن لوگوں کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد باقی نہ رہا انہوں نے عورتوں کو چہار دیواری کے اندر بند کر دیا۔"

---

[1] یہ پوری بحث اس بلا حوالہ ہے۔ حدیث یا تاریخ کی کسی کتاب کا نام اشارۃً بھی نہیں دیا گیا ہے جس سے پتہ چل سکے کہ ان روایات کا ماخذ کیا ہے اور ان کے تاریخی استناد کا کیا پایہ ہے۔ آگے ہم اس معاملہ کی اصل حقیقت واضح کریں گے۔

اس قسم کی نادر تحقیقات جو یہ حضرات فرما رہے ہیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کی نگاہوں میں جلال و جمال تو سمایا ہوا ہے ہالی وڈ کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا، اور وہی سوسائٹی جو ہالی وڈ میں قائم ہے یہ حضرات پاکستان میں بھی قائم کرنے کے متمنی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ہالی وڈ کے نام سے ہالی وڈ کی تہذیب کو یہاں مقبول بنانا ممکن نہیں ہے اس لیے انہوں نے اس پر مدینہ لائف کے لیبل لگانے شروع کر دیے اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہالی وڈ کی ساری تہذیب تو درحقیقت سرقہ ہے ہماری اس اسلامی تہذیب کا جو خیر القرون میں مکہ و مدینہ اور طائف میں رائج تھی، لیکن بعد میں عباسیوں کے دور زوال میں آ کے اس تہذیب کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔

جن پاکیزہ خاندانوں کی عفیفات کی یہ تصویر دکھائی گئی ہے اُن کی تصویر ذرا ایک نظر اس رنگ میں بھی ملاحظہ فرمائیے جس رنگ میں قرآن نے ان کو نمایاں کیا ہے۔ اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکے گا کہ یہ تصویر کتنی مختلف ہے اس تصویر سے جو یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اہل بیت کو مخاطب کر کے یہ تعلیم دی گئی ہے:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ	اور اپنے گھروں میں ٹک کے رہو، اور
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى	سابقہ جاہلیت کے سے انداز اختیار نہ
وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ	کرو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی
الزَّکٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ	رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا یُرِیْدُ	کرو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے اے اہل
اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ	بیت نبی! کہ تم سے آلودگی کو دور کرے
اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ	اور تمہیں اچھی طرح پاک کرے اور تمہارے
تَطْهِیْرًا ۝ وَاذْکُرْنَ	گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت
مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِکُنَّ	کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔ بے شک

مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّاۗىِٕمِيْنَ وَالصّٰۗىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝

(الاحزاب - ۳۳: ۳۴ - ۳۵)

اللہ نہایت ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں ـــ ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

یہ ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال کو مخاطب کر کے دی گئی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال میں حضرت فاطمہ زہرؓا اور اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا جو درجہ و مرتبہ ہے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مذکورہ ہدایات و اوصاف کا کوئی بہترین نمونہ اگر ہو سکتا تھا تو یہی خواتین ہو سکتی تھیں اور اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان اوصاف کا بہترین عملی نمونہ تھیں۔ پھر یہ بات کس قدر بعید از قیاس ہے کہ جن پاکیزہ خواتین کی زندگیاں اس قرآنی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں انہی کی پوتیاں اور بھانجیاں ایسی اٹھیں کہ انہوں نے مدینہ وطائف میں لٹریری سیلون (LITERARY SALOONS) بنا بنا کے اپنے اردگرد گویوں اور بذلہ سنجوں کے مجمعے اکٹھے کرنے شروع کر دیے اور اپنے حسن و جمال کی نمائش کے لیے اسی تبرجِ جاہلیت کو اختیار کر لیا جس کی ان کی بزرگ والدہ اور خالاؤں کو قرآن مجید میں ایسی صراحت کے ساتھ ممانعت کی گئی تھی۔

لیکن ہم تھوڑی دیر کے لیے دل پر انتہائی جبر کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا ہوا اور حضرت سکینہ نے اپنے عظیم الشان باپ اور اپنی عظیم المرتبہ دادی اور عائشہ نے اپنے صالح باپ اور اپنے جلیل القدر نانا اور اپنی جلیل المرتبہ خالہ کی پسندیدہ اور اسلامی روشیں ترک کر کے وہی آزادیاں اور بے قیدیاں اختیار کر لیں جن کا مضمون نگار صاحب نے ذکر فرمایا ہے مگر سوال یہ ہے کہ "زوال اور انحطاط" کا نمونہ ان میں سے کون سا طریقہ ہے؟ وہ جس کا ذکر قرآن نے فرمایا ہے اور جس پر حضرت فاطمہ زہرا اور حضرت عائشہ صدیقہؓ تھیں یا وہ جس کو مضمون نگار صاحب نے حضرت سکینہ بنتِ حسین اور عائشہ بنتِ طلحہ کی طرف منسوب کیا ہے؟

ستم پر ستم یہ ہے کہ یہ حضرات اتنی بڑی تہمتیں ایسے پاکیزہ خاندانوں کی بہوؤں بیٹیوں پر لگا جاتے ہیں اور یہ کچھ نہیں بتاتے کہ یہ بات وہ کس سند کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں تاکہ کوئی شخص اس کی لغویت اگر واضح کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ شہید کربلا کی صاحبزادی فاطمہ زہراؓ کی پوتی، صدیقِ اکبرؓ کی نواسی اور اُم المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کی بھانجی کی حرمت ان کا مرید صاحبان کی نظر میں بس اس قدر ہے کہ "ایک قدیم مؤرخ لکھتا ہے"

کی سند پر جو خرافات چاہیے ان کی شان میں بکتے چلے جائیے۔ معلوم نہیں یہ قدیم مؤرخ کون ہے؟ کس ذہن کا آدمی ہے؟ اس کا دین و مذہب کیا ہے؟ اور کن ذرائع معلومات کی بنا پر یہ باتیں وہ روایت کر رہا ہے؟ محض قدیم ہونا یا مؤرخ ہونا تو اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُس نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر ایمان لے آئے۔ قدیم و جدید دونوں ہی گروہوں میں ہم ایسے بہت سے مؤرخوں سے واقف ہیں جن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا اور ہے کہ انبیاء و صالحین اور ان کے پاکیزہ گھرانوں کی زندگیوں کو بگاڑ کے پیش کریں تاکہ اس طرح اپنے ان آقاؤں کی عیاشیوں اور رنگ رلیوں کے لیے شرعی دلائل فراہم کر سکیں جن کا وہ نمک کھاتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ "پاکستان ٹائمز" کے مضمون نگار صاحب نے اس گروہ کے کن "قدیم مؤرخ" کی خوشہ چینی سے تحقیقات کے یہ نوادر فراہم فرمائے ہیں۔

حوالہ کی غیر موجودگی میں مذکورہ بالا بیانات کی تردید یا تصدیق کا معاملہ تو مشکل ہے، لیکن عام ناظرین کی واقفیت کے لیے یہ بتا دینا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے یہاں ادب و تاریخ کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو زمانۂ انحطاط کے بگڑے ہوئے خلفاء اور امراء نے اپنے نمک خواروں سے اس لیے لکھوائی تھیں کہ ان کی تفریحِ طبع کا سامان مہیا ہو سکے۔ ان کتابوں میں گپوں اور قصّوں، عشقیہ حکایتوں اور فسانوں، راگوں اور گیتوں کی لپیٹ میں صحابہ و صحابیاتؓ یا ان کے وابستگان سے متعلق ایسے واقعات بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے ان فاسق امراء کی رنگ رلیوں کے لیے دلیل ہاتھ آئے۔ ہمارے عربی لٹریچر میں کتاب الاغانی اس طرز کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں عربی گیتوں اور راگوں، گویّوں اور گانے والیوں کے ذکر کے سلسلہ میں بہت سے ایسے واقعات بھی ضمناً آتے ہیں جن کا مقصد پڑھنے والے کے ذہن پر یہ اثر ڈالنا ہوتا ہے کہ یہ رنگینیاں کچھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ رسولؐ اور صحابہؓ

کے زمانہ میں بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح آج موجود ہیں۔ اس قسم کے جتنے واقعات ان کتابوں میں ملتے ہیں بیشتر یا تو محض گپ ہیں یا ان میں صداقت کا کوئی ذرہ ہے تو اس کی نوعیت بس یہ ہے کہ عام فطری کمزوری کے تحت خدا سے کوئی بات کسی سے صادر ہوئی ہے اور اس کو نمک مرچ لگا کر ایک پوری یوسف زلیخا تیار کر لی گئی ہے۔ کوئی صاحب نقد اور صاحب علم تو اس طرز کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن جو لوگ مکھیوں کی طبیعت رکھتے ہیں اور بیشتر گندی ہی چیزوں پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں وہ اس قسم کی کتابوں سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں[1]۔ یہ کتابیں جس

---

[1] میں نے اس اہتمام کے ماخذ کے متعلق یہ رائے محض اپنے ذوق کی بنا پر قائم کی تھی اور چونکہ ملتان جیل میں جہاں میں نے یہ کتاب لکھی ہے، اس معاملہ کی تحقیق کے لیے ضروری کتابیں میسر نہیں تھیں اس وجہ سے پورے اعتماد کے ساتھ اس کی تردید یا تصدیق میرے لیے مشکل تھی لیکن حسن اتفاق سے ایک روز جیل کی لائبریری کی فہرست الٹتے پلٹتے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نظر ایک کتاب پر پڑ گئی جس کا نام تھا: سکینہ بنت حسین رض۔ کتاب نکلوا کر دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کے مصنف مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ کتاب کی نوعیت کا اندازہ تو شرر صاحب کے نام ہی سے ہو گیا تھا لیکن مزید اطمینان کے لیے کتاب پڑھی تو اس کے ماخذ کے متعلق میرا گمان صحیح نکلا۔ شرر صاحب نے اپنے مذاق کے مطابق یہ ناولانہ مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے اگرچہ بیان کردہ واقعات کے حوالے نہیں دیے ہیں اور نہ ایک ناولانہ مضمون میں اس کی ضرورت تھی لیکن بحیثیت مجموعی کتاب کے ماخذ کا پتہ دے دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکثر و بیشتر حصہ کتاب الاغانی سے ماخوذ ہے۔

یہ کتاب ہمارے بزرگ اسلاف کی رندی کا اشتہار دینے کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ لوگوں کو رندی و ہوسناکی کے لیے دلیل اور سند ہاتھ آئے۔ چنانچہ مصنف نے اپنا مقصد کتاب کے شروع میں خود ہی ظاہر کر دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"ہمارے قدیم مؤرخین چونکہ عموماً لوگوں کے تقدس اور پارسا ہونے ہی کی فکر میں زیادہ رہتے ہیں لہٰذا ہم افسوس کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔۔۔"

مصنف کے مذاق اور رجحان کا اندازہ اس کے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رح جیسے خلیفہ راشد کے متعلق لکھے ہیں:

مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اگر کوئی شخص اسی مقصد کے لیے ان کی طرف رجوع کرے تو ہر چند ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بے ذوقی ہے تاہم اس کی آزادئ انتخاب کا حق تسلیم کر کے ہم اس پر صبر کر لیں گے۔ لیکن یہ تو بڑا ظلم ہے کہ حدیث اور رجال اور تاریخ و سیرت کی مستند کتابوں کو چھوڑ کر اب اس طرح کی خرافات میں سے جھوٹی سچی روایتیں جمع کی جائیں اور دُنیا کو یقین دلایا جائے کہ دیکھو یہ ہیں اسلامی تہذیب، اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کے اصل نمونے۔ یہ حرکت بالکل اسی طرح کی ہے جیسے کوئی شخص اسرائیلی خرافات میں سے وہ سارا مواد جمع کرلے جس میں خدا کے پیغمبروں پر جھوٹ، زنا، چوری، شراب خوری اور طرح طرح کی بداخلاقیوں کی تہمتیں لگائی گئی ہیں اور پھر کہے کہ دیکھو، یہ ہیں وہ اصل کام جن کے لیے خدا نے اپنے پیغمبر دنیا میں بھیجے تھے۔

آغا خاں کی رہنمائی:

یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کہ 'ڈان' میں مسلمانوں کے قدیم ناصح مشفق جناب سر آغا خاں بالقابہ کی وہ تقریر نظر سے گزری جو انہوں نے ۸ر فروری ۱۹۵۰ء کو مسٹر زاہد حسین گورنر سٹیٹ بنک کے مکان پر بین الاقوامی امور سے متعلق ادارہ کے اہتمام میں کراچی

=

عمر بن عبد العزیز جو تمام خلفائے اسلام میں ملاؤں اور خشک مزاج زاہدوں کی شان رکھتا تھا اس کو (حضرت سکینہ کے جوڑے کی عام تقلید کو) روکنے کے لیے اپنی شاہی قوت سے کام لینا پڑا۔ وہ ہاتھ میں دُرّے لیے پھرتا اور جس کے سر پر جُمّہ سکینہ دیکھتا دُرّے لگاتا۔"

شرر صاحب نے کتاب الاغانی وغیرہ جیسی کتابوں سے اخذ کر کے اس قسم کے بہت سے فقرے اپنے ناولوں کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پھیلائے ہیں اور اب ہمارے نئے محققین نے شرر صاحب کے ناولوں ہی کو اپنی تحقیقات کا ماخذ بنالیا ہے۔

کے اونچے طبقہ کے ایک اجتماع کو مخاطب کرکے مرشدانہ انداز میں فرمائی ہے۔ تقریر کا موضوع تھا: مسلمان سلطنتوں کا عروج و زوال اور ان کا مستقبل؛ اس تقریر میں آپ نے تاریخ کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے ارباب کار کو جو قیمتی مشورے دیے ہیں ان میں سب سے زیادہ زریں مشورہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

"یقین کیجیے کہ حقیقی اسلام کبھی بھی جامد نہیں تھا، یہ ہمیشہ ایک متحرک شے رہا ہے۔ بنو امیہ کے عظیم الشان دور میں، جبکہ اس کی بنیادیں گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں، یہ متحرک، نہایت سادہ اور واضح تھا..... اپنے مؤرخوں اور مفکروں کو ہدایت کیجیے کہ وہ اپنی ساری توجہ بنو امیہ کے اس عظیم الشان صد سالہ دور پر مرتکز کریں اور آپ اس اُموی دَور کو نمونہ کے طور پر سامنے رکھیے۔"

آگے چل کر اس "مثالی دَور" کے فضائل و محاسن کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے اسلامی تہذیب و معاشرت کے انہی دو نمونوں کا ذکر فرمایا ہے جن کا ذکر 'پاکستان ٹائمز' کے مضمون نگار صاحب کے حوالہ سے اُوپر گزر چکا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اس سلسلہ میں دو مثالیں بالکل واضح طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی سکینہ اور طلحہؓ کی صاحبزادی (حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نواسی) نے عرب کی زندگی میں معاشرتی اور علمی حیثیت سے جو آزادانہ حصہ لیا اس کا موازنہ انیسویں صدی کی خواتین کے مرتبہ سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابتدائی اُموی خلفاء کے زمانہ ہی میں مکہ اور مدینہ میں گانے بجانے کا معیار کس قدر بلند ہو چکا تھا۔ اب اس کے مقابلہ میں ذرا اس نفرت و حقارت کو دیکھیے جو اس زمانہ کے بعض گمراہ مسلمانوں کو فنونِ لطیفہ (گانے بجانے) سے ہے۱۔"

۱۔ ڈیلی ڈان، کراچی: ۹ فروری ۱۹۵۰ء

اس تقریر کو پڑھ کر آغاخاں بالقابہ کی مرشدانہ قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اسلام کا دم بھرتے ہوئے اسلام سے فرار کی جو راہ انہوں نے سجھائی ہے وہ اب تک یہاں کے نکتہ وروں کو نہیں سوجھی تھی۔ ہمارے اربابِ کار ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ کوئی ایسی راہ ڈھونڈ نکالیں کہ اسلام کے ساتھ ناتا بھی نہ ٹوٹے اور یہ اسلام اُن کے پیشِ نظر مقاصد میں خلل انداز بھی نہ ہو سکے۔ لیکن ایسی راہ ڈھونڈ نکالنا جو کفر و اسلام، شیطان و رحمان، یزدان اور اہرمن دونوں کو جمع کر سکے، ہر بدعتی کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک مرشدِ کامل کی ضرورت تھی اور اس تقریر کو پڑھنے کے بعد ہر شخص تسلیم کرے گا کہ یہ مرشدِ کامل اگر کوئی ہو سکتا تھا تو بس ہمارے آغاخان بہادر بالقابہ ہی ہو سکتے تھے جو اسلام اور اسلام کی تاریخ پر اتنی عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔

سر آغاخاں بالقابہ نے ہمارے اربابِ کار کو جو راہ سجھائی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلام کے نعرہ کے ساتھ کفر قائم کرنا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اپنے مؤرخوں اور مفکروں کو اس کام پر لگا دو کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے دور کو چھوڑ کر بنی اُمیہ کے صد سالہ دور کو اسلامی تاریخ کا خیر القرون ثابت کرنے پر اپنی تمام مساعی مرکوز کر دیں۔ کیونکہ یہی وہ دورِ میمون ہے جس میں اسلام کی بنیادیں گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں، جس میں سکینہ اور عائشہ جیسی فیشن ایبل خواتین جو بیسویں صدی کی خواتین کے لیے بھی قابلِ رشک ہو سکتی ہیں، پیدا ہوئیں جس میں گانے بجانے کا وہ فنِ شریف اپنے عروج و کمال کو پہنچا جس کو اس زمانہ کے گمراہ مسلمان نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اگر ہمارے اربابِ حل و عقد سر آغاخاں کے اس زریں مشورہ کو قبول کر لیں تو قراردادِ مقاصد پاس کر دینے کے بعد سے وہ جس الجھن میں پھنس گئے ہیں اس سے بیک جنبش وہ رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس "دورِ مبارک" میں، جس میں آغاخان کے حسبِ ارشاد

"اسلام کی بنیادیں پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ رکھی گئیں" صرف سکینہ اور عائشہ کے قابلِ اتباع اور رقص و سرود کے ہنگامے ہی موجود نہیں ہیں' بلکہ اس کی گہرائیوں اور وسعتوں میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ہمارے اربابِ کار کو تلاش ہے اور وہ مل نہیں رہا ہے اور اگر مل رہا ہے تو اسلام کے لیبل کے ساتھ نہیں مل رہا ہے۔

اس کے لیے بس ایک کام' جیساکہ سر آغا صاحب نے مشورہ دیا ہے، کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی ریسرچ کے پورے ڈیپارٹمنٹ کو کچھ مزید توسیع کے ساتھ اس کام پر مامور کر دیجیے کہ وہ اس دور کی گہرائیوں میں اچھی طرح اتر کر جو گوہرِ مقصود ہاتھ آئیں ان کو اکٹھا کر لیں۔ اگر ہم خامیوں کی معلومات بھی اس کارِ عظیم میں کچھ مفید ہو سکیں تو اس دور کی بابت جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ بھی اشارات کی صورت میں یہاں نوٹ کیے دیتے ہیں' شاید یہ تلاشِ مقصود میں کچھ رہنمائی کر سکیں۔

اس دور کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملکِ عضوض" اور "جبریت" کے دور سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر ہمارے اربابِ اقتدار اپنی مطلق العنانی اور اپنے استبداد کے استحکام کے خواہاں ہوں تو یہ دورِ جبریت اس کے لیے گہری بنیادیں مہیا کر سکتا ہے۔ اس دور میں اسلام کے جمہوری و شورائی نظام کو بھی ملوکیت اور ولی عہدی سے بدل ڈالا گیا۔ اگر ہمارے اربابِ کار تخت و تاج کے قیام کے ارمان رکھتے ہوں تو اس دور سے بڑھ کر ہماری تاریخ کا کوئی دور بھی اس ارمان کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں ہے۔ اس دور نے خلفائے راشدینؓ کے خدمتِ خلق اور محنتِ بے مزد کے طریقہ کو قیصریت و کسرویت سے بدلا۔ اگر ہمارے حکمران قیصریت و کسرویت کے احیاء کے متمنی ہیں تو صرف یہی دور ہے جو ان کے لیے مثال کا کام دے سکتا ہے۔ اس دور میں مروانی امراء کی عیاشیاں اور سفاکیاں ظہور میں آئیں۔ اگر ہمارے اربابِ کار ان کے راستوں پر چلنا چاہتے ہیں تو بلاشبہ ان چیزوں کے لیے تاریخ کا قابلِ فخر دور یہی ہے۔ اسی دور میں حجاج بن یوسف

ثقفی، خالد قسری اور ابن ہیرہ جیسے درندے پیدا ہوئے جن کی سفاکیوں سے خدا کی زمین چیخ اٹھی۔ اگر ان کے کارناموں کو پھر زندہ کرنا پیش نظر ہو تو لازماً اسی دور کی گہرائیوں اور وسعتوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس دور کے بعض مصلحین نے اپنے زمانہ کے امراء سے خطاب کر کے کہا تھا کہ خدا نے تم کو اپنی مخلوق کا چرواہا بنایا تھا مگر تم نے بھیڑیے بن کر ان کی کھالیں ادھیڑ ڈالیں، ان کے گوشت کھا لیے اور ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے چھوڑ دیے۔ اگر ہمارے خداوندانِ نعمت بھی یہی چاہتے ہیں کہ گڈریے کے بجائے بھیڑیے بن کر ہماری کھالیں کھینچیں اور ہمارے گوشت نوچیں تو بلاشبہ اس سیرت کی بہترین مثالیں بنو امیہ کے اسی صدسالہ دور میں مل سکیں گی۔ نیز یہی دور ہے جس نے آغا خاں کے بقول فاطمہ زہراؓ کی جگہ سکینہ اور عائشہ صدیقہؓ کی جگہ عائشہ بنت طلحہ کو جنم دیا۔ جن کی آزادی، جن کے فیشن اور جن کی مجلس آرائیوں کو آغا خاں بیسویں صدی کی خواتین کے لیے بھی قابلِ رشک قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ بات ہے تو عورتوں کی اصلاح کی جو تحریک ہمارے لیڈروں نے چلائی ہے اس کی تقویت و تائید کے لیے بھی بہترین دینی مواد اسی دور کی تاریخ سے مل سکے گا۔

الغرض سر آغا خاں بہادر نے اپنے ایک اشارہ سے ہمارے اربابِ اقتدار کی وہ ساری الجھنیں دور کر دی ہیں جن میں وہ قرار دادِ مقاصد پاس کر کے مبتلا ہو گئے تھے۔ اب اگر ہمارے مؤرخوں اور مفکروں نے سر جورج کے اس صدسالہ دور کے مطالعہ میں محنت کی اور اس کی گہرائیوں میں اتر کر اس دور کے سارے آثار بے نقاب کر لیے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ تجدید و اصلاح کا وہ عظیم الشان کام جو ہماری قیادتِ علیا کے پیش نظر ہے، اس کے لیے کوئی چیز امریکہ و انگلستان سے درآمد نہیں کرنی پڑے گی، بلکہ پورا سامانِ تعمیر اور سارا مسالہ اپنے ہی گھر سے فراہم ہو جائے گا جس کو کوئی شخص بھی پردیسی یا غیر اسلامی کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔

سر آغا خاں کی یہ تقریر پاکستان کے اونچے حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ یہاں تک کہ 'ڈان' نے اس پر داد دی ہے کہ اقبال کے بعد آغا خاں کے سوا یہ حکیمانہ باتیں اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔

دھمکیاں:

سر آغا خاں کی یہ تقریر جیسی کچھ بھی ہے اس کا ایک پہلو کم از کم یہ قابل تعریف ہے کہ وہ ماضی کے ساتھ ہمارے ربط کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، اگرچہ وہ ماضی عہد رسالت اور دور خلفائے راشدین کے بجائے دور بنی امیہ ہی ہو۔ لیکن یہاں تو اب علی الاعلان یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ ہم اب تک جس انداز سے اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے اپنی زندگی کے معاملات پر غور کرتے رہے ہیں اب آزادی کے حصول کے بعد ان میں تبدیلی کرنی پڑے گی اور اگر طوعاً یہ تبدیلی نہ کی گئی تو مصطفیٰ کمال کی طرح جبراً یہ تبدیلی کرائی جائے گی اور ساتھ ہی تمام اسلامی اقدار کی کھلم کھلا توہین کرتے ہوئے عورتوں کو سوسائٹی کے خلاف بغاوت پر ابھارا جا رہا ہے۔ لاہور کے ایک روزنامہ کے ادارتی مقالہ کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:

> "عورتوں کی آزادی یا پردہ و نقاب پوشی کے سوال پر فرنگی اقتدار کے دور میں ہم جس انداز سے اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے بحث کرتے رہے ہیں اب اس میں بنیادی تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ہماری معاشرت میں وہ توازن و ہم آہنگی اور وہ تناسب و یک رنگی پیدا نہ ہو سکے گی جس کے بغیر قوموں کی سربلندی محال ہے[1]۔"

---

[1] روزنامہ احسان، لاہور: ۴ فروری ۱۹۵۰ء

پردہ کا مسئلہ جب بھی زیر بحث آیا، خواہ فرنگی اقتدار کے دور میں یا اس اسلامی اقتدار کے عہد میں، اس بحث میں کم از کم پردہ کے حامیوں کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ اسلام کے سوا کچھ اور نہیں رہا ہے۔ اب اگر قومی سربلندی اور معاشرت میں توازن و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اب زندگی کے مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بجائے صرف قومی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے اور اسلام کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

اس سلسلہ میں آگے چل کر ایڈیٹر صاحب دھمکی دیتے ہیں کہ لوگوں کو چاہیے کہ سیدھے سیدھے وقت کے تقاضوں کے آگے سرِ تسلیم خم کریں اور معاشرت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے عورتوں کو آزادی دیں، ورنہ یہاں بھی مصطفیٰ کمال کا طریقہ اختیار کرکے صبح و شام میں عورتوں کو پردہ سے باہر نکال دیا جائے گا۔ کیونکہ معاشرت میں انتشار باقی رکھ کے دشمن کو فائدہ اٹھانے کا موقع بہرحال نہیں دیا جا سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

> "آزادی کے حصول کے بعد معاشرت کے مختلف دائروں میں ہم آہنگی و یکجہتی پیدا کر کے قوم وقت کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا کام دو ہی طرح ہو سکتا ہے، یا تو مصطفیٰ کمال کی قسم کا کوئی آمرِ مطلق پیدا ہو جو ڈکٹیٹر بن کر اس قسم کے احکام نافذ کرے کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت کے بعد سے کوئی عورت پردہ کے اندر نہ رہ سکے گی اور زندگی کے میدان میں مردوں کے سر کا بوجھ بنے رہنے کے بجائے اپنی راہ آپ تلاش کرے گی، اور یا پھر عوام میں خود اتنا شعور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے قومی و ملی مفاد کو سوچیں اور شخصی تعصبات کو ملکی مفادات کے ساتھ متصادم نہ ہونے دیں ——— پاکستان میں ابھی تک اس دوسری شکل کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن اگر اس طرف توجہ نہ

کی گئی تو پھر دو نادو ہی نتیجے برآمد ہوں گے : یا تو ہم میں کوئی آمرِ مطلق پیدا ہو جائے یا ہمارے اس اندرونی اختلال وانتشار سے اغیار ناجائز فائدہ اٹھائیں۔"

اس آمرانہ دھمکی کے بعد ایڈیٹر صاحب سوسائٹی کے موجودہ معروف ومنکر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تلقین فرماتے ہیں کہ جب تک معروف ومنکر کے موجودہ معیارات قائم رہیں گے اس وقت تک ترقی کے راستہ پر قدم بڑھانا ممکن نہیں ہے۔ اور جو خواتین اس راہ میں آگے بڑھ گئی ہیں وہ بھی نکو بن کر رہ جائیں گی۔ اس لیے سب سے مقدم کام یہ ہے کہ خیر وشر کے موجودہ اقدار وپیمانے بدلیں۔ یہاں تک کہ جن باتوں کو آج عورت کے لیے ہنر کہا جاتا ہے وہ عیب خیال کی جانے لگیں، اور جن چیزوں کو عیب سمجھا جاتا ہے وہ ہنر سمجھی جانے لگیں۔ فرماتے ہیں :

"اصل سوال یہ ہے کہ آیا ہم اس قسم کے مشاغل (نرسنگ کی طرف اشارہ ہے) کو مسلم خواتین کے لیے باعث عزت سمجھتے ہیں یا مجبوری وبے حرمتی کا حیلہ قرار دیتے ہیں۔ پھر سوال صرف نرسنگ ہی کا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اسی قسم کے دوسرے بیسیوں مسائل بھی اُلجھے ہوئے ہیں۔ اب تک ہماری عورتوں کو صرف مردوں کا دست نگر ہونا سکھایا جاتا ہے۔ ان سے صرف یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شادی سے پہلے باپ بھائی کی اور شادی کے بعد شوہر کی خدمت گزاری واطاعت شعاری کا ہنر سیکھیں۔ گھر کے مرد جو کچھ پیدا کریں اسی میں تنگی ترشی کے ساتھ اپنا وقت گزاریں اور قومی زندگی کو خوشگوار بنانے میں اپنا دائرۂ عمل صرف زچہ خانے اور باورچی خانے تک محدود رکھیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زندگی کا یہ نظریہ اب بھی ہمارے لیے سودمند ہے یا نہیں ؟ کیا خواتین کو قومی وملی مشاغل کے وسیع ترمیدانوں سے علیحدہ رکھنے اور انہیں صرف مردوں کی خدمت گزاری یا تفریح طبع کا آلۂ کار بنائے رکھنے کا یہ طریقہ نفع بخش ہے یا

خطرناک ؟ اس وقت تک تو ہماری معاشرت کا ڈھانچہ یہ ہے......
کہ اگر کوئی عورت بغاوت کرکے اپنا راستہ بنائے تو اسے یا تو مجبوری کی بنا پر
معاف کر دیا جاتا ہے مگر حقارت کے ساتھ یا اس کی اس حرکت کو شرمناک قرار
دے کر اس کے خلاف نت نئے شگوفے چھوڑے جاتے ہیں۔ ہم نے
عصمت و عفت کو صرف عورت کے ساتھ مخصوص کر کے عصمت و عفت
کی حفاظت و صیانت کی راہ بھی خود ہی تجویز کر رکھی ہے۔"

اپنی اس حالت پہ ماتم کرنے کے بعد ایڈیٹر صاحب زندہ قوموں کا اُسوۂ حسنہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے ہیں اور عورتوں کو مخاطب کرکے للکارتے ہیں کہ تم خود اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرو اور خود اعتمادی کے عزائم کے ساتھ معاشرت کے ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ دو۔ اور اگر کچھ بزعم خود غلط لوگ اس پر طعن کرتے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو۔ بھلا یہ بھی زندگی کا کوئی مطمح نظر ہوا کہ شادی کے لیے ایک شوہر تلاش کر لیا اور اسی شوہر کی خدمت گزاری میں زندگی گزار دی۔ اپنی خودی اور خودداری کو ابھارو اور زندگی کے وسیع میدانوں میں جولانیاں دکھاؤ۔ اس سوسائٹی کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو اب تک یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ وقت کے نئے تقاضوں کے ساتھ گزرے ہوئے ماضی کا جوڑ لگانا ممکن نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

"ہم سمجھتے ہیں کہ نہ صرف زندگی میں، بلکہ ان تمام قومی و ملی مشاغل کے میدانوں میں خواتین کو آگے آنا چاہیے جن میں ان کی خدمت قوم و ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے سود مند ہو سکتی ہے۔ ہماری خواتین کو چاہیے کہ اگر ضرورت ہو تو اس سلسلہ میں تھوڑی سی جرأت اخلاقی کا مظاہرہ کرنے سے بھی نہ جھجکیں..... ہماری خواتین کو محسوس کرنا چاہیے کہ بیچ کی چند صدیوں نے ہماری معاشرت کا جو ڈھانچہ بنا دیا ہے وہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اس کی ہر ہر

گلی اور ہر ہر کوچے کو مقدس سمجھ کر آنکھیں بند کیے اس پر چلتی رہیں۔ اگر کچھ
برخود غلط حلقے ان کو ملعون کرتے ہیں تو اس کی پروا نہ کریں، صرف اپنے ضمیر
اور اپنے خدا[1] کے آگے خود کو جواب دہ سمجھیں اور تعمیرِ پاکستان کی ان منزلوں میں
قدم بڑھانے سے محض اس لیے نہ ہچکچائیں کہ وہ دنیا کیے گی جو دنیا ابھی تک
ماضی و مستقبل کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے ہی میں مجرمانہ تغافل سے کام لے رہی
ہے۔ شادی کے لیے ایک شوہر تلاش کر لینا اور زندگی کو اسی شوہر کی
خدمت گزاری کے سانچے میں ڈھالتے رہنے کی کوشش کرنا کوئی مطمح نظر
نہیں، کوئی مقصد نہیں۔ اصل مقصد اور اصل مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ تعمیرِ ملت
کے وسیع تر مفاد کے لیے خود کو سازگار بنائیں اور اپنی خودی اور خودداری کو
دبانے کے بجائے اسے ابھاریں اور جلا بخشیں"

یہ ایڈیٹر صاحب اخباری رقابت کے تحت کمیونسٹوں پر اکثر نہایت تیز و تند
تنقیدیں کرتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اگر ضرورت پیش آتی ہے تو مذہب کو
بھی اپنی حمایت میں استعمال فرماتے ہیں لیکن مذکورہ بالا سطریں غور سے ملاحظہ فرما کر
فیصلہ کیجیے کہ کیا کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی تصور کر سکتا ہے کہ ان کا لکھنے والا
اسلام سے دور پرے کا بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے۔ کیا لینن اور سٹالن کا کوئی کٹر سے
کٹر مرید بھی اسلام اور اسلامی روایات پر اس سے زیادہ بے باکانہ حملہ کر سکتا ہے؟
اسلام پر پیدا ہونے اور اسلامیت کے دعویٰ کے باوجود ان کے اخلاقی و معاشرتی

---

[1] خدا کا نام لینے کی یہ ادا غالباً ایڈیٹر صاحب نے اپنے خداوندانِ کراچی سے سیکھی ہے۔ وہ بھی خدا اور اس کے دین کی خوب مرمت کر لینے کے بعد اسی طرح خدا کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔

نظریات بعینہ وہی ہیں جو دنیا کی دوسری مادیت پرست اور کافر قوموں کے ہیں۔ چنانچہ انہی صاحب کے ایک اور ایڈیٹوریل کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں :

> "خدا نے انسان کو بالکل آزاد بنا کر پیدا کیا ہے۔ مگر انسان نے اپنے معاشرتی مفاد کی خاطر خود ہی اپنے اوپر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ قدرت کا قانون تو یہ ہے کہ ہر عورت ہر مرد کے لیے کھلی ہوئی ہے لیکن ہم نے معاشرت میں نفاست و حسن پیدا کرنے اور انسانی نسل کو اخلاقی بلندیوں کی بلند سطح پر لانے کے لیے جنگل کے جانوروں کی اتباع میں جنسی جذبات کو کھلی چھٹی نہیں دے رکھی ہے۔ اس کے برعکس ہم نے ازدواج و مناکحت کی پابندیاں عائد کرنا خود اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہم کسی انسان کی آزادی پر بھی گرفت کرتے ہیں کہ عصمت فروشی میں بے باکی سے کام نہ لے، حالانکہ یہ اس کی آزادی میں مداخلت ہے"[1]

ان کوششوں کا مجموعی اثر :

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کہنا یہ تھا کہ اس طرح کا فاسد اور زہریلا لٹریچر ہے جو اس تحریکِ آزادیٔ نسواں کی حمایت کے لیے اس ملک کا پورا انگریزی پریس اور اردو پریس کا ایک بہت بڑا حصہ رات دن پوری سرگرمی کے ساتھ گھر گھر پھیلا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس تحریک کو قوم کے لیڈروں کی سرپرستی حاصل ہو، جس کے اندر عمالِ حکومت اپنے سرکاری فرائض سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہوں، جس کی حمایت

---

[1] روزنامہ احسان، لاہور، ۵ جنوری ۱۹۵۰ء

کے لیے پریس کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہو کہ جس طرح کا بھی فاسد اور محرک و مہیج مواد ان کے ہاتھ لگے اس کو پھیلائیں، وہ اگر جنگل کی آگ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک طرف تو مشہور قرار دادِ مقاصد ہے جو کتاب و سنّت والی تہذیب قائم کرنے کے لیے پاس کی گئی ہے، لیکن اس کے تقاضوں کی تکمیل میں اب تک ایک مُردہ سنّت بھی پورے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں زندہ نہ کی جاسکی، اور دوسری طرف اس تحریک کی گرماگرمی کا یہ عالم ہے کہ اگر تہذیبِ اسلامی کے کچھ نقوش اپنی سخت جانی کی وجہ سے ہماری حیاتِ اجتماعی کے کسی گوشہ میں دبے دبائے پڑے رہ گئے تھے تو وہ بھی صبح و شام میں مٹا چاہتے ہیں۔ اس کا صحیح صحیح اندازہ آپ کو کرنا ہو تو آپ مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ لیجیے۔ یہ علاقہ مغربی پاکستان کے مقابل نسبتاً اپنی مشرقیت اور اسلامیت کے لیے مشہور یا ہمارے تجدد پسند حضرات کے نقطۂ نظر سے اپنی رجعت پسندی کے لیے بدنام رہا ہے۔ بالخصوص عورتوں کے معاملہ میں تو اس کا حال مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب سے بالکل ہی مختلف رہا ہے۔ لیکن ان مشترکہ مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے آزادیٔ نسواں کی تحریک اب وہاں اس منزل میں پہنچ گئی ہے کہ مشرقی بنگال مسلم لیگ کونسل تک اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہوگئی۔ چنانچہ اس کا مندرجہ ذیل ریزولیوشن ملاحظہ ہو:

"یہ کونسل مشرقی پاکستان کے کلبوں میں عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط اور دوسری اس قسم کی خلافِ شریعت اخلاق سوز حرکات کی پُرزور مذمت کرتی ہے..... ان چیزوں کو دیکھ کر عوام کا غصہ اس قدر بھڑک رہا ہے کہ اگر حکومت نے فوراً مداخلت کرکے ان حرکات کو روک نہ دیا تو عوام کوئی سخت

کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔[1]

قوم کی واحد نمائندہ جماعت کے اس احتجاج کے بعد، جس میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر ان خلافِ شریعت اور اخلاق سوز حرکات کی روک تھام کے لیے حکومت نے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا تو عوام قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے، یہ تحریک ہر احتجاج و اعتراض سے بالکل بے نیاز ہو کر جس طرح آگے بڑھتی رہی ہے اس کا اندازہ بیگم شاہ نواز کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوگا جو انہوں نے مذکورہ بالا تجویز کے پورے سات ماہ بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مشرقی پاکستان کے دورہ سے واپس آکر کراچی میں پریس کو دیا ہے:

"مشرقی پاکستان میں عورتوں کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بہت سے شعبہ ہائے زندگی میں مشرقی پاکستان کی عورتیں مغربی پاکستان کی عورتوں سے آگے نکل گئی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے میڈیکل کالج میں لیڈی پروفیسر اور ان چار لڑکیوں کا ذکر کیا جنہوں نے ہوائی جہاز چلانے کے لائسنس حاصل کیے ہیں۔ آپ نے کہا مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے ذمہ دار افسروں بلکہ وزراء تک کی بیویاں بھی گھروں میں بند نہیں رہتیں، وہ مردوں

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ یہ تجویز اس مسلم لیگ نے پاس کی ہے جس کے لیڈر اور جس کی حکومت ہی ان ساری حرکات کے ذمہ دار ہیں اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس "آزادانہ اختلاط" اور جن "اخلاق سوز حرکات" کو یہ حضرات بھی اخلاق سوز اور خلافِ شریعت قرار دیں اس کی نوعیت کیا کچھ ہو سکتی ہے۔

[2] ڈیلی ڈان۔ کراچی: ۲۳ جون ۱۹۴۹ء

کے پہلو بہ پہلو تعمیرِ ملت[1] کے کاموں میں حصہ لینے کے لیے باہر نکل آئی ہیں[2]۔

عوام کی ذہنیتیں جس تیزی کے ساتھ متغیر ہو رہی ہیں اور ہر محفل میں عورتوں کو پیش پیش رکھنے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا مذاق جس سرعت کے ساتھ لوگوں میں ترقی کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب مسلمان میلاد کی مجلسیں بھی منعقد کرتے ہیں تو ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان میں تقریر کرنے کے لیے کسی عالمِ دین یا کسی مرد لیڈر کے بجائے کسی خاتون ہی کو بلائیں۔ اس وقت جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، میرے سامنے ۱۶۔ جنوری ۱۹۵۰ء کے 'ڈان' کا پرچہ پڑا ہوا ہے۔ اس میں حیدرآباد (سندھ) کی ایک انجمن کے جلسۂ میلاد کی روداد شائع ہوئی ہے۔ انجمن کا نام ماشاءاللہ 'مجلس اسوۂ رسول' ہے۔ جلسہ بھی میلادِ نبوی کا ہے، لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس 'مجلس اسوۂ رسول' نے اسوۂ رسول بیان کرنے کے لیے جس عالمۂ کتاب و سنت اور پیکرِ اسوۂ رسول کو دعوت دی تھی وہ مس فاطمہ جناح ہیں۔ چنانچہ اخبار نے غالباً موصوفہ کی پیروئ اسوۂ رسول ہی کو نمایاں کرنے کے لیے ان کی تقریر کے ساتھ ان کی تصویر بھی شائع کی ہے تاکہ مسلمان خواتین اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسوۂ رسول دراصل یہ ہے جس پر مُلاؤں نے پردہ ڈال دیا تھا اور

1۔ 'تعمیرِ ملت' ایک اصطلاح ہے جس سے مراد اسی طرح کے کارنامے ہیں جن کا ذکر اوپر مشرقی بنگال مسلم لیگ کونسل کے ریزولیوشن میں آیا ہے اور جن کے خلاف کونسل کو صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ کہیں لفظ ملت سے کوئی شخص ملتِ ابراہیم حنیفؑ (علی اصحابہا الصلوٰۃ والسلام) مراد نہ لے بیٹھے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی ملت ہے۔ ہر عربی لفظ لازماً اسلامی ہی نہیں ہوتا۔

2۔ ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور: ۲۳۔ دسمبر ۱۹۴۹ء

جو پاکستان بننے کے بعد اب بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے۔ اس جلسہ میں موصوف نے اُسوۂ رسول پر جو تقریر ارشاد فرمائی ہے وہ بھی نہایت سبق آموز ہے۔ ہمارے پاکستان میں کچھ فیشن سا ہو گیا ہے کہ جو صاحب بھی کوئی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں وہ کلمہ "اتحاد، یقین، نظم" (UNITY, FAITH, DISCIPLINE) کی تلاوت سے اس کا آغاز فرماتے ہیں اور ظاہر کرنے کی کوشش فرماتے ہیں کہ یہی تین کلمات 'کُنْ فَیَکُوْنَ' ہیں جن سے دنیا وجود میں آئی ہے اور انہی تین کلمات کے بل پر یہ پورا کارخانۂ کائنات چل رہا ہے۔ چنانچہ اسی عام روش کی تقلید کرتے ہوئے موصوف نے بھی اپنی تقریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دنیا میں جو عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں وہ بھی انہی تین میں سے ایک کلمہ یقین (FAITH) کی مرہونِ احسان ہیں۔ معلوم ہوا کہ تکمیلِ دین تو اب کہیں جا کر بیسویں صدی میں ہوئی ہے، جبکہ بقیہ دو کلمے بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس سے پہلے سارا کام ایک تہائی دین ہی سے چل رہا تھا۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ!

اس مجلسِ اسوۂ رسول کے جلسۂ میلاد النبیؐ کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی بھی تشریف فرما تھے اور انہوں نے وہاں تقریر بھی فرمائی، لیکن اے۔ پی۔ پی۔ کے رپورٹر نے اپنی طویل رپورٹ میں، جو اخبار کے پورے ڈیڑھ کالموں میں شائع ہوئی ہے، ان کا ذکر صرف ڈیڑھ سطر میں اس طرح کیا ہے کہ "جلسہ میں وہ بھی موجود تھے اور انہوں نے مس فاطمہ جناح کی تقریر سے پہلے ایک تقریر فرمائی"۔ ناظرین واقف ہوں گے کہ یہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانہ بھون کے ایک مشہور عالم، علومِ دینی کے مدرس، اور حدیث وفقہ کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی قدر و عافیت اس اسلامی مملکت میں اب یہ رہ گئی ہے کہ میلاد کی مجلسوں میں بھی بے چارے اگر بلائے جاتے ہیں تو مس فاطمہ جناح کے ایک تابع مہمل کی

حیثیت سے۔ قانون سازی اور دستور سازی وغیرہ تو مولویوں کی دسترس اور ان کے مبلغ علم سے بالاتر خیال کی ہی جاتی تھیں، اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمانوں کو میلاد بھی بیگمات ہی کا پسند آتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام اب اس کام کے لیے بھی کچھ بہت زیادہ موزوں نہیں خیال کیے جاتے۔ اگر مسلمانوں کے ذہنی تغیّر کی رفتار یہی رہی تو ہمارا اندازہ یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اندر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے یہ حضراتِ علماء نمازِ جنازہ کے لیے بھی ناموزوں قرار دے دیے جائیں گے اور اگر کسی لیڈر صاحب کی وفات ہو گی تو مسلمان یہی چاہیں گے کہ ان کی نمازِ جنازہ بھی شیخ الاسلام صاحب کے بجائے کوئی لیڈر صاحب یا لیڈرانی صاحبہ ہی پڑھائیں۔

گزشتہ مباحث کا خلاصہ:

یہ ساری تفصیل ہم نے ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے پیش کی ہے جن کو سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی کچھ سجھائی نہیں دیتا اور جو ابھی تک یہی خواب دیکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اُن کے لیڈر رات دن اسلامی نظام قائم کرنے کی تیاریوں میں سرگرم ہیں اور کوئی شخص ان کو آنکھیں کھولنے اور اصل حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کے مشورہ کو قبول کریں اُلٹے اس کے سر ہو جاتے ہیں کہ تم تو ہمارے لیڈروں سے بدگمانی کرتے ہو۔ اس قسم کی خوش گمانی کے مریضوں کے لیے ہم نے چند مہینوں کے صرف چند اخباروں سے یہ اقتباسات پیش کیے ہیں (اور واضح رہے کہ جمع شدہ مواد کا نہایت قلیل حصّہ اس مضمون میں دیا جا سکا ہے) امید ہے کہ یہ مواد سرمۂ بصیرت کا کام دے گا اور وہ اس کی مدد سے اصل حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ جو سمجھ دار اور منصف مزاج آدمی بھی اس پورے سلسلہ کو غور سے پڑھے گا اس پر یہ حقیقت واضح

ہو جائے گی کہ اس ملک کے ارباب اقتدار مغرب زدگی کی جو لعنت اس ملک پر
مسلط کرنے کے متمنی ہیں اس کا پہلا تجربہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت وہ پہلے
ہماری بہنوں اور بیٹیوں پر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک
صحیح ہے کہ اگر عورتوں نے اس طاعون کے جراثیم قبول کر لیے تو ہماری سوسائٹی کا بقیہ
حصہ اس سے بچنا بھی چاہے گا تو نہ بچ سکے گا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے آل
پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی شاخوں کا جال، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، پاکستان
کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا ہے[1] اور یہ کام سرکاری اہتمام اور سرکاری سرپرستی میں انجام
پایا ہے، اور انجام پا رہا ہے۔ ہز ایکسی لینسی بیگم ناظم الدین صاحب اور مس فاطمہ جناح
اس ایسوسی ایشن کی سرپرست ہیں۔ بیگم لیاقت علی خان اس کی صدر ہیں۔ اضلاع میں
اس کی کرتا دھرتا اعلیٰ سرکاری حکام کی بیگمات ہیں۔ اس کی کانفرنسیں گورنمنٹ ہاؤس
میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے اس ایسوسی ایشن کو باضابطہ طور پر تسلیم
کر کے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ان تمام معاملات میں، جن کا تعلق عورتوں سے ہو،
محکمہ متعلقہ ایسوسی ایشن مذکورہ سے استصواب کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھائے۔

ان تیاریوں کے ساتھ یہ حضرات ہماری خواتین میں جس قسم کا انقلاب برپا کرنے
کے درپے ہیں، اگر کوئی شخص انہی کی تقریروں اور تحریروں کی روشنی میں اس انقلاب
کے مطمح نظر کو سمجھنا اور متعین کرنا چاہے تو اسے معلوم ہو گا کہ ہماری سیاست، معاشرت
اور اخلاق کے تمام موجودہ اقدار اس کی زد میں ہیں اور اگر یہ واقع ہو گیا تو ہماری زندگی

---

[1] اسی ایسوسی ایشن کی کارکن خواتین کی رہنمائی و قیادت میں آئندہ نسل کی بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کو تربیت کرنے اور پروان چڑھانے کے لیے بلیو برڈز (BLUE BIRDS) گرل گائیڈز، زنانہ رضاکار کور، زنانہ نیشنل گارڈز اور اینجلز آف مرسی (ANGELS OF MERCY) یعنی نرسوں وغیرہ کی مختلف تنظیمیں اور تحریکیں سرگرم عمل ہیں۔

کے ان تین گوشوں میں نہایت اہم اور بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں گی جن کا اجمالی تصور ذہن میں پیدا کرنے کے لیے ہم ان کو یہاں الگ الگ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ سیاسی پہلو سے یہ حضرات جو انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں وہ مرد اور عورت کی کامل مساوات کے نظریہ پر مبنی ہے، حقوق میں بھی مساوات اور فرائض میں بھی مساوات۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے، اس لیے اسے وہ سب کچھ کرنے کا موقع ملنا چاہیے جو مرد کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ عورتوں اور مردوں کی جدوجہد کے میدان الگ الگ ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں کے لیے ایک ہی میدان ہے اور ایک ہی گوئے و چوگان، اس لیے دونوں کو زندگی کے ایک ہی میدان میں بالکل ایک ہی طرز پر بازی کھیلنی چاہیے۔ جو شہری حقوق مردوں کو حاصل ہیں وہی شہری حقوق عورتوں کو حاصل ہیں۔ ریاست کی جو ذمہ داریاں مردوں پر عائد ہوتی ہیں بے کم و کاست وہی ذمہ داریاں عورتوں پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ جس طرح مرد شہری اور ملکی حقوق ادا کرنے کے لیے پولیس اور فوج میں بھرتی کیے جاتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی پولیس اور فوج میں بھرتی کی جائیں۔ جس طرح مرد سپاہی، پائلٹ، کپتان اور کمانڈر بنتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی سپاہی، پائلٹ، کپتان اور کمانڈر بنیں۔ جس طرح مرد وکیل اور جج، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر، سفیر اور وزیر، گورنر اور گورنر جنرل ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی ان تمام مناصب عالیہ پر سرفراز ہونا چاہیے۔ جس طرح مردوں کو الیکشن لڑنے، ممبر منتخب ہونے، پارلیمنٹری سیکرٹری، وزیر اور وزیر اعظم بننے کے مواقع حاصل ہیں اسی طرح ان ساری قسمت آزمائیوں کے لیے عورتوں کو بھی مردوں کے برابر مواقع ملنے چاہئیں۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ اور جدوجہد زندگی کے ہر گوشہ میں ان لوگوں کے نزدیک مرد عورت ہے اور عورت مرد۔ اس مساوات کو یہ حضرات اجتماعی زندگی میں ہم رنگی و

ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے بغیر ملک
ترقی کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اس کے بغیر، ہمارے وزیر خزانہ
کے ارشاد کے مطابق، کوئی ملک معاشی اعتبار سے بھی آسودہ حال نہیں ہو سکتا۔ اسی
چیز کو مطمعِ نظر قرار دے کر آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن جدوجہد کر رہی ہے اور
اس کے اس مطالبہ کو ہمارے وزیرِاعظم صاحب اس ملک کی ترقی اور مدافعت کے
نقطۂ نظر سے ناقابلِ انکار قرار دیتے ہیں۔

۲۔ معاشرتی پہلو سے جس تبدیلی کے یہ لوگ خواہاں ہیں اور جس کے لیے مذکورہ بالا
مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہیں خواہاں ہونا چاہیے بھی، وہ یہ ہے کہ پردہ کے
احکام کو یکسر لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔ عورت کا حسن و جمال ان لوگوں کے نزدیک
چھپانے کی چیز نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ نمایاں کر کے سامنے لانے کی چیز ہے
تاکہ لوگ ان کے حسن و جمال میں قدرت کی صنعت گری کے تماشے دیکھ سکیں۔ پردہ
ان لوگوں کے خیال میں ایسے لوگوں کی ایجاد ہے جو خود اخلاقی اعتبار سے پست تھے،
انہوں نے اپنی کمزوریوں کو مغلوب کرنے کے بجائے الٹے عورتوں کو گھروں کی چار دیواری
کے اندر بند کر دیا۔ ان حضرات نے علمی و تاریخی تحقیقات سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اسلام
کے دورِ اول میں عورتیں آرٹ سیلون بنا بنا کے بیٹھتی تھیں اور ان کے ارد گرد شعراء،
اُدباء، بذلہ سنج اور لطیفہ گو، بھانڈ اور گویّے اکٹھے ہوتے تھے اور وہ ان سب کی
رہنمائی اور سرپرستی فرماتی تھیں۔ ان لوگوں کی یہ بھی تحقیق ہے کہ اُس عہد کی عورتیں
برقعوں اور نقابوں میں لپٹی رہنے کے بجائے اپنے حسن و جمال کے آئینہ میں لوگوں کو اللہ
کی قدرت و صناعی کی نشانیوں کا مشاہدہ کراتی پھرتی تھیں۔ لیکن عباسیوں کے دورِ آخر
میں جب نیتوں میں خیر القرون والی پاک بازی اور نگاہوں میں عہدِ صحابہ کی سی پارسائی
باقی نہ رہی تو مجبوراً لوگوں کو مجبوراً آیاتِ الٰہی کی نمائش کا یہ کاروبار ختم کرنا اور

اپنی عورتوں کو گھروں میں بند کرنا پڑا۔ اس گروہ کے بعض دوسرے محققین، جو اس تحقیق سے شاید مطمئن نہیں ہیں، کہتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہؓ پردہ کرتی تھیں لیکن یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ قائد اعظم کی بہن پردہ نہیں کرتی اور ہمارے زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے لیے قابلِ اتباع نمونہ قائد اعظم کی بہن ہی کا ہے نہ کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کا۔ اس حلقہ میں پردہ کے متعلق نرم سے نرم رائے ہمارے وزیر خزانہ آنریبل مسٹر غلام محمد کی ہے جو اس "رواج" کو "ملّایانہ تحکّم" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ بہرحال استدلال کی نوعیت میں تھوڑا بہت فرق ہو تو ہو لیکن اس نتیجہ پر سب متفق ہیں کہ پردہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کا جلد سے جلد دُور ہونا ضروری ہے۔

۲۔ اخلاقی پہلو سے یہ لوگ جس تبدیلی کے خواہاں ہیں وہ یہ ہے کہ عورت شرم و حیا اور عصمت و عفت کے رسوم و قیود میں جکڑی ہوئی رہنے کے بجائے 'مادام' آذوری کی پاکستان اکیڈمی آف آرٹ میں جا کر جسم بنانے اور جسمانی حرکات میں موافقت و ہم آہنگی پیدا کرنے کا فن سیکھے؛ تال، سُر اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرے؛ خٹک ناچ کو، جو مسلمانوں کا خاص ناچ ہے اور جسے اب ہندوؤں نے اپنا رکھا ہے، ہندوؤں سے واپس لے اور اکابر شاہانِ مغلیہ کے اس ورثہ کو اس کے شایانِ شان ترقی دے؛ گانے بجانے میں 'جو مغلوں کے دور میں لڑکیوں کی تربیت کا جزو رہا ہے' کمال پیدا کرے اور بین الاقوامی نمائش فنون میں جو ۱۹۵۱ء میں لندن میں منعقد ہو رہی ہے 'پاکستان کو دنیا کے تہذیبی نقشہ (CULTURAL MAP) پر جگہ دلائے۔ صرف ایک شوہر تلاش کر لینا اور اس کی اطاعت و وفاداری اور بچوں کی پرورش و نگہداشت میں پوری زندگی کھپا دینا ان حضرات کے نزدیک نہ کوئی مقصدِ زندگی ہے اور نہ باپ، بھائی یا شوہر کی کمائی پر صبر و شکر کی زندگی گزار دینا عورت

کے لیے کوئی قابلِ تعریف بات۔ ان حضرات کے نزدیک عورت کی اصل قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ قدرت نے اُس کو جن اسلحہ سے مسلح کیا ہے اُن سے لیس ہو کر گھروں کی چار دیواری سے باہر نکلے، ہالی وڈ کے ذواقین و ذواقات کی طرح اپنے کمالاتِ فن دکھلائے، دلوں کو تسخیر کرے، محفلوں میں نمایاں ہو، مجلسوں میں دادِ تحسین حاصل کرے۔ سوسائٹی نے اگر اس آزادی پر کچھ اخلاقی اور شرعی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں تو ان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو سوسائٹی اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتی کہ موجودہ وقت کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اب ماضی کی روایات اپنے اوپر لادے لادے پھرنا ممکن نہیں ہے، وہ سوسائٹی اس قابل نہیں ہے کہ اُس کی باتوں پر کان دھرا جائے۔ ان حضرات کے نزدیک قدرت کی طرف سے تو ہر عورت ہر مرد کے لیے 'کھلی ہوئی' ہے، صرف حسنِ معاشرت کے خیال سے انسان نے ازخود اپنے اوپر ازدواج و مناکحت کی پابندیاں عائد کر لی ہیں، اب اگر حسنِ معاشرت کا مطالبہ یہ ہو کہ ہر عورت ہر مرد کے لیے پھر سے کھول دی جائے تو انسان اپنی عائد کردہ پابندی اٹھا بھی سکتا ہے یا کم از کم اس کو کسی دوسری شکل میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ان بزرگوں کے خیال میں عصمت فروشی بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے، برائی اگر ہے تو عصمت فروشی میں بے باکی سے کام لینا ہے اور یہ بھی غالباً اس لیے برا ہے کہ اس سے لوگوں کو کچھ منفرد غلط مثالیں مل جاتی ہیں جن کی وجہ سے وہ عورتوں کی آزادی کے معاملہ میں ذرا مذبذب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حق بحقدار رسید کا معاملہ خواہ کسی طرح بھی ہو، بجائے خود تو قابلِ اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔

نظامِ اسلامی کے قیام کا دعویٰ:

یہ خلاصہ ہے اس پیشِ نظر انقلاب کا جو ہمارے اربابِ حل و عقد ہماری خواتین

کی زندگیوں میں برپا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے یہ خلاصہ بیشتر انہی کے یا اُن کے نمائندوں اور کارندوں کے الفاظ میں یہاں رکھ دیا ہے تاکہ جو کچھ یہ حضرات چاہتے ہیں وہ بیک نظر خود پیش کرنے والوں ہی کے الفاظ میں قارئین کے سامنے آجائے۔ پچھلے صفحات میں ہر چیز کے دلائل و شواہد پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں تاکہ اگر اس کے کسی فقرہ کی صداقت میں کسی صاحب کو کچھ تردد ہو تو وہ اس کے اصل و ماخذ کو بغیر زحمت کے معلوم کر سکیں۔

یہ ہے وہ اسلامی نظام جو ہمارے اربابِ کار اس ملک میں قائم فرمانا چاہتے ہیں اور جس کی تیاریوں میں وہ رات دن سرگرم ہیں۔ یہی ہے وہ چیز جس کی نسبت ہمارے وزیرِ اعظم صاحب نے فرمایا:

"پاکستان اس غرض کے لیے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے[1]۔"

یہی ہے اس اسلامی حکومت کا تہذیبی نقشہ جس کی نسبت ہمارے وزیرِ اعظم صاحب نے ۸۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کوہاٹ ضلع مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ میں فرمایا کہ اگر وہ پاکستان میں قائم نہیں کی گئی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا:

"جہاں تک لوگوں کی اس امنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت چلائی جائے دستور ساز اسمبلی کی پاس کردہ قراردادِ مقاصد اس کی کافی ضمانت ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت نہ قائم کی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا......۔ ہم دنیا کو یہ دکھانے کا داعیہ رکھتے ہیں کہ فقط اسلام ہی وہ اصولِ زندگی ہے جو دنیا کے

---

1. ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور، ۲۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء

درپردہ مصائب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔"

یہی ہے وہ اسلامی نظام جس کا ذکر ہمارے وزیر اعظم صاحب نے ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ان شاندار الفاظ میں فرمایا:

"پاکستان بس ایک اور صرف ایک ہی آرزو رکھتا ہے اور اس کی وہ آرزو ہے خدمت اسلام اور خدمت بنی نوع انسان ...... میرا یہ محکم یقین ہے کہ آج کی دنیا جن مشکل مسائل سے دوچار ہے ان کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مذہب کے اور دوسرے کو دنیا کے حوالے نہیں کرتا، وہ اپنے پیروؤں کی پوری زندگی ــــ انفرادی ہو یا اجتماعی ــــ کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالے کر دینا اس کی تعلیم ہے۔[۲]"

یہی ہیں اسلام کے وہ بہترین اصول جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی اور جن کے مطابق پاکستان کی حکومت کو بنانے کا عزم وزیر اعظم صاحب نے ان پر شوکت الفاظ میں ظاہر فرمایا:

"میں نے حصول پاکستان سے قبل مسلمان مائے وبندوں سے جو وعدے کیے تھے میں انہیں بھولا نہیں ہوں۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے قالب میں ڈھال سکیں۔ ہم نے ایک ایسے ملک

---

۱ ڈیلی دی پاکستان ٹائمز، لاہور، ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء
۲ ڈیلی ڈان، کراچی، ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء

کے قیام کا مطالبہ کیا تھا جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔ اس مقصد کے لیے ہزار ہا مسلمانوں نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔ تقریباً ستر لاکھ مسلمانوں نے اسی مقصد کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا اور مرتے کھپتے پاکستان تک پہنچے[1]۔ ہم نے مسلمان عوام سے جو وعدہ کیا تھا اب ہمیں اسے پورا کرنا ہے اور ایک ایسی حکومت قائم کرنی ہے جس کا نصب العین سچا اسلامی نصب العین ہو۔ دنیا کو آج اسلام کی ضرورت ہے[2]۔"

یہی ہے اسلام کا وہ مستقل نظامِ حیات جو ہمارے وزیرِ خزانہ نے مدت العمر کے مطالعہ کے بعد دریافت فرمایا ہے اور جس کی تحسین وہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"ہمارا ایک مستقل نظامِ حیات ہے، ہمارا ایک الگ تمدن ہے، ہمارے اپنے طور طریقے ہیں اور ہم انہی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب اسلامی اصول کے مطابق متحد ہونا اور انہی کے ذریعہ عروج حاصل کرنا چاہتے ہیں[3]۔"

اور یہی ہے "مقدس پیغمبر" کا وہ طریقہ جس کی طرف واپس آنے کی تلقین بیگم لیاقت علی خاں اور اُن کے زمرہ کی دوسری بیگمات میلاد کی مجلسوں میں مسلمان عورتوں

---

[1] اب یہ تو پوچھنا ان ستر لاکھ مہاجرین کے ذمہ ہے جو مرتے کھپتے پاکستان پہنچے ہیں کہ کیا واقعی انہوں نے اپنی جان، مال، آبرو اسی لیے نثار کی اور اپنے گھر بار اسی لیے چھوڑے کہ وہ ہندوستان میں اپنی عورتوں کو بے پردہ کرنا چاہتے تھے اور ہندو انہیں اس "اسلامی تہذیب" اور ان "اسلامی احکام" پر عمل کرنے سے روک رہے تھے؟

[2] روزنامہ نوائے وقت، لاہور: ۰ جنوری ۱۹۵۰ء

[3] بہتر ہوگا اگر ناظرین ۹۔ فروری ۱۹۵۰ء کے "ڈان" میں آذوری صاحب کے اس رقص کے اشتہار پر بھی نظر ڈال لیں جس کے آنریبل وزیرِ خزانہ کے زیرِ سرپرستی انعقاد کا اعلان ہوا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلامی اصول کے مطابق عروج حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

[4] ڈیلی پاکستان ٹائمز۔ لاہور ۱۰۔ دسمبر ۱۹۴۹ء

کو فرمایا کرتی ہیں۔

یہ حضرات اگر یہ فتنہ تنہا اپنے بل بوتے پر اٹھاتے اور اسلام کو اس بیچ میں نہ گھسیٹتے تو جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے، یہ چیز کچھ ایسی تشویش انگیز نہیں تھی۔ بہزار جہالت کے باوجود ابھی ہماری قوم میں اتنی اخلاقی و مذہبی حس باقی ہے کہ آسانی کے ساتھ اس راستہ پر نہیں جا سکتی جس پر یہ حضرات اس کو ڈال دینا چاہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہالی وڈ کی اس تہذیب کو مدینہ کے دورِ صحابہ کی تہذیب کے نام سے اور اس سرتاسر جاہلی اور شیطانی نظامِ معاشرت کو اسلامی نظامِ معاشرت کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے دین سے بے خبر مسلمانوں کا ایک طبقہ اور ان کی عورتیں اس فتنہ کا شکار ہو رہی ہیں اور اندیشہ ہے کہ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ اس وجہ سے ہم ان حضرات کے اس پیشِ نظر انقلاب کے ان تینوں پہلوؤں پر، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں تنقید کر کے دیکھیں گے کہ جس اسلام اور جس اسلامی نظام کی محبت میں یہ لوگ چور ہیں کیا فی الواقع وہ مساواتِ مرد و زن کے اس نظریہ اور ان معاشرتی و اخلاقی تصورات کو کسی درجہ میں بھی قبول کرتا ہے جن کو ہمارے یہ اربابِ کار اس زعم اور اس ڈھٹائی کے ساتھ اسلام کے نام سے پیش کر رہے ہیں؟

باب ۲

نظریۂ مساواتِ مرد و زن شریعت کی کسوٹی پر

اسلامی نظریۂ مساوات اور مغربی نظریۂ مساوات کا فرق :

اسلام کے معاشرتی و اجتماعی نظام کا جس شخص نے تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہوگا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام مرد و زن میں مساوات تو بلاشبہ تسلیم کرتا ہے لیکن وہ مساوات اس مساوات سے بالکل مختلف ہے جس کے قائل جان سٹورٹ مل اور لینن کے معتقدین ہیں۔

یہ لوگ جس مساوات کے قائل ہیں وہ تو یہ ہے کہ قدرت نے جن قوتوں اور قابلیتوں سے مرد کو مسلح کیا ہے بعینہٖ انہی قوتوں اور قابلیتوں سے عورت کو بھی مسلح کیا ہے اور مرد جو کچھ کر سکتا ہے عورت بھی وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس لیے معاشرہ میں عورت و مرد کی جدوجہد کا دائرہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور لہٰذا ان کے حقوق و فرائض بھی بالکل ایک سے ہونے چاہئیں۔

اس کے برعکس اسلام جس مفہوم میں عورت و مرد کی مساوات کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ جس نفسِ واحدہ سے اللہ تعالیٰ نے مرد کو پیدا کیا ہے اسی نفسِ واحدہ سے عورت کو پیدا کیا ہے، جس طرح مرد اس نظامِ کائنات کا ایک ضروری عنصر ہے اور قدرت نے ایک خاص مقصد سے اس کو تخلیق کیا ہے اس طرح عورت بھی اس کائنات کی مشین کا ایک ضروری پرزہ ہے اور قدرت نے اس کی تخلیق سے

ایک ضروری غرض وابستہ کی ہے، جس طرح مرد قدر و احترام کا مستحق ہے اسی طرح عورت بھی قدر و احترام کی حقدار ہے، جس طرح مرد کچھ خاص قابلیتیں اور قوتیں لے کر آیا ہے اسی طرح عورت بھی کچھ مخصوص قوتیں اور قابلیتیں لے کر پیدا ہوئی ہے؟ جس طرح مرد اپنے کچھ خاص جذبات و عواطف اور کچھ فطری مقتضیات و مطالبات رکھتا ہے اسی طرح عورت بھی اپنے کچھ خاص رجحانات و میلانات اور کچھ فطری مطالبات و مقتضیات رکھتی ہے۔ اس لیے عورت اور مرد دونوں کو اپنے اپنے فطری رجحانات و میلانات کے مطابق سورج اور چاند کی طرح اپنے اپنے دائروں میں قدرت کے منشا کی تکمیل میں سرگرم رہنا چاہیے، نہ سورج کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ چاند کی سرگرمیوں میں خلل انداز ہو اور نہ چاند کو یہ آزادی ملنی چاہیے کہ وہ سورج کے کاموں میں کوئی مزاحمت پیدا کر سکے۔ معاشرے کے اندر دونوں پر ان کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے ذمہ داریاں ہونی چاہئیں اور ان کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان کو حقوق ملنے چاہئیں۔ ہر ایک کی تخلیق سے فطرت کا جو منشا ہے اس کو وہ فطرت کے ضابطوں کے تحت اپنے اپنے حدود کے اندر یکساں آزاد اور یکساں پابند رہ کر پورا کرے۔

مساوات کے یہ دونوں نظریے اپنی اساس و بنیاد اور اپنے نتائج و اثرات میں اتنے مختلف ہیں کہ جس طرح مشرق و مغرب کو یکجا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان دونوں نظریات کو جمع کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ مغربی نظریۂ مساوات کے معتقد ہیں تو اسلام کا نام لینا چھوڑ دیجیے اور اگر اسلام کے نظریۂ مساوات پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر سلامتی اسی میں ہے کہ اس کے مخالف رجحان سے استعفا دے دیجیے۔ ان دونوں نظریات کی اساس پر حیات اجتماعی کی جو عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں وہ اپنی بنیاد، اپنے ڈھانچہ، اپنے طرز تعمیر، اپنی ہیئت مجموعی اور اپنے سکونتی فوائد و مقاصد کے لحاظ سے اس درجہ مختلف النوع ہوتی ہیں کہ ممکن نہیں ہے کہ ایک کا پیوند دوسرے کے

ساتھ لگایا جا سکے اور اگر اس قسم کی کوئی کوشش کی گئی تو اس سے ہماری حیاتِ اجتماعی کے کسی ایک ہی گوشہ میں بھینگا پن نہیں پیدا ہو گا، بلکہ یہ ایک غلطی ہمارے پورے نظامِ اجتماعی کو بھینگا اور بے ہنگم بنا کے رکھ دے گی۔ نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ کے سوا اس شتر گربگی کا کچھ اور حاصل نہیں نکلے گا۔

مغربی نظریۂ مساوات اپنی سادہ اور ابتدائی حالت میں بہت معصوم نظر آتا ہے اور جذبات کی رَو میں بہنے والے مردوں اور عورتوں کو اپیل بھی کرتا ہے۔ لیکن جب اس کو بنیاد قرار دے کر اس پر حیاتِ اجتماعی کی تعمیر شروع کی جاتی ہے، تب اس کے عیوب کھلنے شروع ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اجتماعیات میں معمولی درک رکھنے والا شخص بھی یہ محسوس کر لیتا ہے کہ جس نظامِ اجتماعی کی بنیاد اس نظریہ پر ہے اس کی بنیاد درحقیقت ریت پر ہے جس کا گر جانا ہر وقت متوقع ہے۔ اس کے برے اثرات جو معاشرے، اور حیاتِ اجتماعی پر مترتب ہوتے ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ تو ہم ان شاء اللہ مستقل عنوان سے بیان کریں گے یہاں صرف اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام عورت اور مرد کو مساوی قرار دینے کے باوجود ان کی صنفی و فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے نظامِ اجتماعی میں ان کو الگ الگ استعمال کرتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اسی مقام میں رکھتا ہے جس مقام میں وہ بہتر طریق پر معاشرے کو اپنی قابلیتوں سے فائدہ پہنچا سکیں۔ برعکس اس کے مغربی نظریۂ مساوات جب ایک مرتبہ اس اصول کو مان لیتا ہے کہ عورت و مرد، دونوں مساوی پیدا ہوئے ہیں تو پھر وہ ان کے صنفی و فطری میلانات کی بنا پر بھی ان کے درمیان کوئی فرق تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اور دونوں کو بالکل ایک ہی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس چیز کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر عورت اپنے صحیح محل کے سوا دوسرے محل میں استعمال کی جاتی ہے تو اس سوءِ استعمال کا مضر اثر خود اس پر بھی مترتب

ہوتا ہے اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے' اسی طرح اگر مرد کو اس کے صحیح محل کے سوا جہاں کے لیے اس کی قابلیتیں تقاضا کر رہی ہوتی ہیں، کسی دوسرے محل میں استعمال کیا جاتا ہے' تو لازماً اس کا اثر بھی یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف مرد کی صلاحیتیں اس سے نقصان اٹھاتی ہیں اور دوسری طرف معاشرہ اس کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے فوائد کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت میں عورت اور مرد' دونوں میں سے کسی کے لیے بھی کوئی ہیٹے پن اور حقارت کا پہلو نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک بعض کاموں کے لیے موزوں ہے اور بعض کاموں کے لیے ناموزوں۔ ہم بدیہی طور پہ یہ جانتے ہیں کہ مرد بار آور کر سکتا ہے' لیکن حاملہ نہیں ہو سکتا؛ اسی طرح عورت حاملہ تو ہو سکتی ہے' لیکن بار آور نہیں کر سکتی۔ لیکن نہ تو حاملہ نہ ہو سکنا مرد کے لیے کوئی شرم کی بات خیال کرتے ہیں اور نہ بار آور نہ کر سکنا عورت کے لیے کوئی حقارت کی بات سمجھتے ہیں، بلکہ نوعِ انسانی کی سلامتی اور اس کا بقا اسی میں دیکھتے ہیں کہ دونوں بغیر کسی منازعت و منافست کے اپنی اپنی قابلیت پر قانع رہیں اور جو کر سکتے ہیں اس کو چھوڑ کر جو نہیں کر سکتے اس کے کرنے کے خبط میں نہ مبتلا ہوں ورنہ یہ منازعت دنیا کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ پھر تعجب ہے کہ اسی طرح لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ مرد میدانِ جنگ کے معرکے تو سر کر سکتا ہے' لیکن گھر گرستی کی الجھنوں کو سلجھانا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس عورت گھر سنبھالنے کے لیے تو خداداد قابلیت اور خداداد عزم و ہمت لے کر آئی ہے' لیکن میدانِ جنگ کے معرکوں کو سر کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ اور اگر دونوں اپنے اپنے دائروں کے اندر اپنے مناسب حال فرائض انجام دینے کے بجائے آپس میں فرائض کے مبادلہ کی

کوشش کریں گے یا اس قدرتی وفطری تقسیم کی حد بندیوں کو توڑ کر مرد عورت کے حدود میں در آنے اور عورت مرد کے حدود میں گھس جانے کے لیے زور لگائے گی تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ دونوں کی قابلیتیں بھی برباد ہوں گی اور دونوں کے متعلقہ فرائض بھی نا ادا شدہ رہ جائیں گے اور پھر اس کا لازمی نتیجہ پوری حیاتِ اجتماعی کے اختلال وانتشار کی صورت میں برآمد ہوگا۔

عورت و مرد کی تخلیق کے ساتھ قدرت نے جو فرائض وابستہ کیے ہیں ان میں سے ہر فرض بجائے خود اتنا ہی اہم اور اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرا فرض۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ گھر کا سنبھالنا کم اہم ہے اور دفتر کا سنبھالنا زیادہ اہم ہے۔ یا بچوں کی پرورش کرنا ایک حقیر کام ہے اور سپہ گری یا تجارت ایک شریفانہ کام ہے۔ نظامِ معاشرت واجتماع کے حفظ و بقا کے جتنے کام بھی ہیں سب یکساں اہم و یکساں ضروری ہیں اور معاشرہ کا جو پرزہ ان کاموں میں سے جس کام کی انجام دہی کے لیے بھی بنا ہے اگر وہ اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دے رہا ہے تو مجموعی مشین کے اندر اس کی قدر و قیمت کسی بڑے سے بڑے پرزے کے برابر ہے اور اس کو حقیر سمجھنے اور نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

نظامِ کائنات کو فاطرِ کائنات نے اس اصول پر بنایا ہے کہ اس کے تمام اجزاء و عناصر ایک دوسرے کے لیے محتاج اور محتاج الیہ بن گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کسی پہلو سے ناقص اور کسی پہلو سے مستغنی ہے، ہر ایک کسی اعتبار سے مطلوب اور کسی اعتبار سے طالب بھی ہے اور اپنی باہمی سازگاری اور تعاون سے یہ اپنے اپنے خلا کو بھرتے اور اپنے اپنے نقص کی تلافی کرتے ہیں۔ زمین اور آسمان، شب اور روز، گرمی اور سردی، بر اور بحر ان سب میں اسی نوعیت کا رابطہ ہے۔ ان میں سے بجائے خود نہ کوئی دوسرے سے مستغنی ہے اور نہ ان میں سے کسی کو یہ

دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ اس نظام کائنات میں جو مقام اس کا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہے یا جو مقصد اس کے ذریعہ سے پورا ہو رہا ہے وہ کسی درجہ میں اور کسی نوعیت سے اس مقصد سے ارفع ہے جو دوسرے کے ذریعہ سے پورا ہو رہا ہے۔ غور کیجیے کہ اس اعتبار سے ان تمام اجزائے مختلفہ میں جو حیرت انگیز مساوات ہے کیا کوئی شخص اس مساوات کا انکار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے ؟ لیکن اس مساوات کے باوجود کبھی آپ نے دیکھا کہ محض اس زعم کی بنیاد پر کہ ہم آپس میں بالکل مساوی ہیں، زمین آسمان سے جا ٹکرائی ہو، چاند نے سورج کے مدار میں گردش شروع کر دی ہو، رات نے دن کے حدود میں مداخلت کر دی ہو، سردی نے گرمی کا روپ دھارن کر لیا ہو اور سمندر نے خشکی پر یلغار کر دی ہو۔ ــــ اگر خدا نخواستہ یہ ہو جائے اور دن دو دن کے لیے نہیں صرف منٹ اور سیکنڈ ہی کے لیے ہو جائے، تو یہ سارا نظام کائنات درہم برہم ہو کے رہ جائے۔

ٹھیک اسی اصول پر عورت اور مرد، دونوں مساوی بھی ہیں، لیکن دونوں کے حدودِ عمل الگ الگ بھی ہیں اور ہمارے معاشرے کا حفظ و بقاء منحصر ہے اس بات پر کہ ہم دونوں کو یکساں عزت و احترام کا مستحق بھی سمجھیں اور دونوں کو الگ الگ بھی رکھیں۔ اگر ہم نے ان میں سے کسی کو بھی حقیر جانا تو سرے سے اس نظام ہی کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گے جس کے بقاء کو قدرت بھی چاہتی ہے اور جس کا بقاء خود ہمارے بقاء کے لیے بھی ناگزیر ہے۔

وہ مساوات جس کو اسلام تسلیم کرتا ہے :

اس تمہید کے بعد اب آئیے دیکھیے کہ اسلام عورت و مرد کی مساوات ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ کس طرح ان دونوں کے لیے الگ الگ حدودِ عمل مقرر کرتا

ہے اور ان کو کشمکش اور تصادم سے بچانے کے لیے کس طرح ان کے حقوق و فرائض میں امتیاز کرتا ہے۔

معاشرے میں عورت و مرد کی مساوات کا اعلان قرآن مجید ان واضح الفاظ میں پیش کرتا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ٱلَّذِى تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ (النسآء - ۴: ۱)	اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم دگر طالب مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے۔ بے شک اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔

اس آیت نے عورت کی کمتری اور حقارت سے متعلق ان تمام تصورات کا خاتمہ کر دیا جو قدیم مذاہب اور تہذیبوں میں پائے جاتے تھے۔ اسلام کا اعلان یہ ہے کہ عورت کوئی حقیر و نجس وجود نہیں ہے۔ وہ کوئی لایعقل اور بے مقصد ہستی نہیں ہے۔ وہ شیطان کی ایجنٹ یا گناہوں کی ٹھیکہ دار بنا کے نہیں اتاری گئی ہے ـــ جیسا کہ بعض مذاہب نے بیان کیا ہے ـــ بلکہ جس نفس واحدہ سے مرد وجود میں آیا ہے اسی سے عورت بھی وجود میں آئی ہے اور جس طرح انسانی معاشرہ کا ایک اہم رکن مرد ہے اسی طرح اس معاشرے کی دوسری اہم رکن عورت ہے۔ اس معاشرے کا وجود، اس کا بقاء اور اس کا تسلسل ان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے کہ ساری اہمیت بس اسی کو دے دی جائے اور نہ یہ بات ہے کہ ان میں سے کسی ایک پر زیادہ اور دوسرے پر کم منحصر ہے کہ جس پر زیادہ منحصر ہے اس کو زیادہ اہمیت دی جائے اور جس پر کم منحصر

ہے اس کا رتبہ گھٹا دیا جائے، بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ خصوصیات اور صلاحیتیں دونوں الگ الگ لے کر آتے ہیں، لیکن اس فرق کی وجہ سے ان میں سے کسی کے لیے بھی نہ اپنی ان خصوصیات پر مغرور ہونا یا ان کے سبب سے اپنے کو حقیر سمجھنا زیبا ہے اور نہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنا اور اس رشک کی وجہ سے ایک دوسرے کی ریس کرنے اور نقل اڑانے لگ جانا جائز ہے۔ بلکہ دونوں کو اپنی خصوصیات کی قدر کرنی چاہیے اور جس نے ان کو بخشا ہے اس کی سچی شکر گزاری اور اطاعت کے ساتھ معاشرہ کی خدمت میں بلحاظ اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی قوت کے اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایمان رکھنا چاہیے کہ خدا جو ان خدمات کا اجر دینے والا ہے، جس ترازو اور باٹ سے مرد کے لیے تولے گا اُسی ترازو اور باٹ سے عورت کے لیے بھی تولے گا۔ عورت سگھڑ پن کے ساتھ ایک گھر چلا کر وہی درجہ اور فضیلت حاصل کر سکے گی جو مرد ایمانداری اور سلیقہ کے ساتھ ایک دفتر چلا کر حاصل کر سکے گا۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ○ (النساء۔ ۴: ۳۲)	جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے اس کی تمنا نہ کرو، مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا، اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا، اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات صاف ہو گئی کہ قدرت کی طرف سے جو

خصوصیات عورت و مرد کو عطا ہوئی ہیں ان میں فضیلت کا پہلو کسی ایک ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس فضیلت میں دونوں برابر کے حصہ دار ہیں اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ عورت و مرد دونوں کی سعادت و کامیابی اس بات میں ہے کہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنے اور اُن کی ریس کرنے کی بجائے ہر ایک اپنے اپنے حصہ کی نعمتوں کے لیے شکر گزار رہے اور ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے۔

قدرت نے اپنی فیض بخشیوں میں مرد یا عورت کسی کے ساتھ بھی بخالت نہیں کی۔ مرد کے اندر اگر تخلیق و ایجاد کا جوہر عطا کیا ہے تو عورت کو اس تخلیق و ایجاد کے ثمرات و نتائج سنبھالنے کا سلیقہ و ہنر عطا فرمایا ہے۔ مرد کو اگر حکمرانی و جہانبانی کا حوصلہ عنایت کیا ہے تو عورت کو گھر بنانے اور گھر بسانے کی قابلیت بخشی ہے۔ مرد کو اگر کچھ خاص علوم و فنون سے طبعی لگاؤ ہے تو عورت کے لیے بھی کچھ خاص علوم و فنون ہیں جن سے اس کو فطری مناسبت ہے۔ مرد اگر اپنے اندر سختی، قوت اور عزیمت کے اوصاف رکھتا ہے تو عورت بھی اپنے اندر دلکشی، شیرینی اور دلربائی کا جمال رکھتی ہے اور قدرت کے اس نگارخانہ کی زیب و زینت ان میں سے کسی ایک ہی رنگ کے اوصاف سے نہیں ہے بلکہ دونوں قسم کے اوصاف سے ہے۔ اس لیے نہ مرد کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ عورت کی دلربائی چرا کر اور اُس کی اداؤں کی نقل اڑا کر مرد مؤنث (SHE MAN) بننے کی کوشش کرے اور نہ عورت کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ مرد کا روپ دھارن کرکے اور اس کے حدود میں مداخلت کرکے زن مذکر (HE WOMAN) بننے کے لیے زور لگائے۔ جو عورتیں یا جو مرد اس قسم کی بھچھوری حرکتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت قدرت کی تقسیم کا مذاق اڑاتے ہیں اس لیے ایسے مردوں اور ایسی عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ اس

سلسلہ میں چند حدیثیں ملاحظہ ہوں :

لعن المتشبهات من النسآء بالرجال[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

عن ابی هریرة قال لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم الرجل یلبس لبسة المرأة و المرأة تلبس لبسة الرجل[2]

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرد پر لعنت کی ہے جو عورت کا سا لباس پہنے اور اس عورت پر لعنت کی ہے جو مرد کا سا لباس پہنے۔

فقالت لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم الرجلة من النسآء[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنانِ مذکر پر لعنت فرمائی ہے۔

ایک اور روایت میں 'لعن المسترجلات' کے الفاظ ہیں اور یہ ساری احادیث مذکورہ بالا آیت کے مفہوم پر روشنی ڈال رہی ہیں کہ مردوں اور عورتوں میں سے کسی کے لیے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ اپنے فطری حدود لانگ کر دوسرے کے حدود میں گھسنے اور ایک دوسرے کی نقل اڑانے کی کوشش کریں، بلکہ ہر ایک کو اپنے اپنے دائرہ کے اندر اپنی خصوصیات پر قائم رہتے ہوئے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اور اللہ سے یکساں اجر کی امید رکھنی چاہیے۔

اس حقیقت کی ایک بہت بڑی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ۲۹
[2] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ۲۹
[3] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ۲۹

کے ایک واقعہ سے بھی ملتی ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید انصاریہؓ ایک مشہور دیندار اور عقل مند صحابیہ اور مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ مجھے عورتوں کی ایک جماعت نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے جو سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں عرض کرنے آئی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں جو میں گزارش کر رہی ہوں۔ عرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ چنانچہ ہم آپ پر ایمان لائیں اور ہم نے آپ کی پیروی کی۔ لیکن ہم عورتوں کا حال یہ ہے کہ ہم پردوں کے اندر رہنے والی اور گھروں کے اندر بیٹھنے والی ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ مرد ہم سے اپنی خواہش نفس پوری کرلیں اور ہم ان کے بچے لادے لادے پھریں۔ مرد جمعہ و جماعت، جنازہ و جہاد ہر چیز کی حاضری میں ہم سے سبقت لے گئے۔ وہ جب جہاد میں جاتے ہیں تو ہم ان کے گھر بار کی حفاظت کرتی اور ان کے بچوں کو سنبھالتی ہیں، تو کیا اجر میں بھی ان کے ساتھ ہم کو حصہ ملے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ فصیح و بلیغ تقریر سننے کے بعد صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم نے ان سے زیادہ بھی کسی عورت کی عمدہ تقریر سنی ہے، جس نے اپنے دین کی بابت سوال کیا ہو؟ تمام صحابہؓ نے قسم کھا کے اقرار کیا کہ نہیں، یارسول اللہ! اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے اسماء! میری مدد کرو اور جن عورتوں نے تم کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے ان کو میرا یہ جواب پہنچا دو کہ تمہارا اچھی طرح خانہ داری کرنا، اپنے شوہروں کو خوش رکھنا اور ان کے ساتھ سازگاری کرنا مردوں کے ان سارے کاموں کے برابر ہے جو تم نے بیان کیے ہیں۔ حضرت اسماءؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر خوش خوش اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی

واپس چلی گئیں[1]۔

حضرت اسماءؓ نے صرف اپنے زمانہ ہی کی خواتین کی نمائندگی نہیں فرمائی بلکہ بعض پہلوؤں سے ہمارے زمانہ کی خواتین کی بھی پوری پوری نمائندگی کر دی ہے۔ اس زمانہ میں آزادئ نسواں کی علمبردار عورتیں جو کچھ کہتی ہیں اس کی ایک بڑی اہم وجہ یہی تو ہے کہ وہ فرائض ان کو حقیر نظر آتے ہیں جو قدرت نے ان کے سر ڈالے ہیں اور وہ فرائض ان کو معزز و محترم نظر آتے ہیں جو مردوں سے متعلق ہیں۔ اس وجہ سے وہ کہتی ہیں کہ یہ کیا ناانصافی ہے کہ ہم عورتیں تو زندگی بھر بچے لادے لادے پھریں اور چولہے چکی کی نذر ہو کے رہ جائیں اور مرد ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کرتے پھریں! اور پھر وہ مطالبہ کرتی ہیں کہ ان کو بھی مردوں کے دوش بدوش ہر میدان میں جدّ و جہد کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ حالانکہ وہ غور کریں تو اس بات کے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہے کہ ایک مردِ مجاہد جو میدانِ جنگ میں جہاد کر رہا ہے اس کا یہ جہاد ہو نہیں سکتا جب تک اس کے پیچھے ایک مجاہدہ بچوں کے سنبھالنے اور گھر کی دیکھ بھال میں اپنی پوری قوتیں صرف نہ کرے! میدانِ جنگ کا یہ جہاد گھر کے جہاد ہی کا ایک پرتو اور مرد کی یہ یکسوئی عورت کی قربانیوں کا ایک ثمر ہے۔ اس لیے اگر مردِ خدا کی راہ میں لڑ رہا ہے تو تنہا مرد ہی نہیں لڑ رہا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خدا کی وہ بندی بھی مصروفِ پیکار ہے جس نے مرد کو زندگی کے دوسرے محاذوں پر لڑنے سے ٹیک دوش کر کے اس میدانِ جنگ کے لیے فارغ کیا ہے اور گھر کے مورچہ کو اس نے خود سنبھال رکھا ہے۔ جذبات سے الگ ہو کر صحیح صحیح موازنہ کر کے اگر دیکھا جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں جہادوں میں سے کوئی بھی کم ضروری ہے

---

[1] کتاب الاستیعاب فی اسماء الاصحاب لابن عبد البر: ج ۲، ص ۷۰۶

یا غیرضروری ہے ؛ انصاف یہ ہے کہ دونوں یکساں ضروری ہیں اس لیے خدا کی نگاہوں میں دونوں کا اجروثواب بھی یکساں ہے۔

وہ مساوات جس کو اسلام تسلیم نہیں کرتا :

مرد و زن کے درمیان یہ مساوات تو اسلام تسلیم کرتا ہے۔ باقی رہی وہ مساوات جو اس نظریہ پر مبنی ہے کہ 'مرد اور عورت دونوں مساوی پیدا ہوئے ہیں' اس لیے انتظام ملک میں دونوں کو مساوی حصہ ملنا چاہیے ؛ یا اس نظریہ پر مبنی ہے کہ 'مرد جو کچھ کر سکتا ہے عورت بھی وہ سب کچھ کر سکتی ہے'! اور اس کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا دائرۂ عمل ایک ہونا چاہیے اور دونوں کے حقوق و فرائض بھی بالکل ایک سے ہیں، تو اس مساوات کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر مساوات کا یہ تصور لے کر اسلام کے معاشرتی و اجتماعی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو نہ صرف اس کے سمجھنے میں ناکامی ہوگی، بلکہ اس قسم کی کوشش کرنے والے کو اسلام سے نہایت دل شکن مایوسی ہوگی اور اگر اس مفروضہ کے تحت آج عورتوں اور مردوں کو تربیت دینے کی کوشش کی گئی تو پوری سوسائٹی کا ذہن و فکر اور اس کی خواہشیں اور عادتیں ایک ایسے غلط سانچہ میں ڈھل جائیں گی کہ کل کو ان کے لیے صحیح اسلامی نظام کو قبول کرنا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔ اور اگر فی الواقع آگے چل کر انہی نظریات پر کوئی اسلامی نظام بنانے کی کوشش کی گئی تو اس کے بنانے کے لیے ناگزیر ہو گا کہ 'شیخ الاسلامی' کے لیے سر آغا خاں بالقابہ کی خدمات جس قیمت پر حاصل ہو سکیں، حاصل کی جائیں، کیونکہ اُن کے سوا کوئی دوسرا اس کارِ عظیم کا اہل نہیں ہے اور اس میں تو ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو 'اسلامی نظام' اس اساس پر بنے گا وہ ایک نہایت ہی نادر اور انوکھی چیز ہوگا، جیسا کہ جائے وزیراعظم

صاحب نے پہلے ہی سے خبر دے دی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آکر اس کو دیکھیں تو یقیناً یہی اعتراف فرمائیں گے کہ یہ وہ اسلام نہیں ہے جو آپ لائے تھے۔

مساوات کے اس نظریہ کو رہنما بنا کر اگر آپ آگے چلیں گے تو ہر قدم پر اسلام سے آپ کی لڑائی ہو گی اور یہ لڑائی صرف اس اسلام سے نہیں ہو گی جسے آپ فقہاء اور ملاؤں کا اسلام کہتے ہیں، بلکہ براہِ راست اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کے احکام سے لڑائی ہو گی اور آپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہے گا کہ یا تو اس غلط نظریہ سے استعفیٰ دے کر سیدھے سیدھے اسلام کو قبول کریں یا پھر صاف صاف اپنے ارتداد کا اعلان کر دیں اور قرآن و رسول کی اطاعت سے الگ ہو کر جس وادی میں آپ کا جی چاہے بھٹکتے پھریں۔

مساوات کا یہ نظریہ یوں تو ہر مرحلہ میں قرآن سے متصادم ہو گا جس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکے گا جب اس کا جوڑ قرآن کے ساتھ لگانے کی کوشش کی جائے گی، لیکن ہم یہاں بھی چند واضح مثالیں پیش کیے دیتے ہیں تاکہ جو لوگ اس تصادم کی نوعیت کا کچھ اندازہ کرنا چاہیں وہ اس کا ایک سرسری اندازہ پہلے سے کر لیں۔

یہ نظریہ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، معاشرتی و اجتماعی دائرہ کے اندر مرد و زن کی کامل مساوات کا مدعی ہے اور کسی پہلو سے بھی مرد کے لیے کسی قسم کی ترجیح تسلیم کرنے کا روادار نہیں ہے، نہ حقوق میں نہ فرائض میں۔ لیکن قرآن مجید اس کے برعکس ایک طرف تو یہ تسلیم کرتا ہے کہ عورت بھی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حقوق رکھتی ہے اور اس کے حقوق بھی اسی طرح قطعی اور واجب الادا ہیں جس طرح مرد کے حقوق قطعی اور واجب الادا ہیں اور دوسری طرف معاشرتی نظام میں وہ مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے، اور اس ترجیح کو نظام معاشرت میں

توازن قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ خاندان کی کفالت کا اصلی بوجھ مرد اٹھاتا ہے ـــ اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہی اس بوجھ کے اٹھانے کے لائق ہے ـــ اس لیے ضروری ہے کہ اس ذمہ داری کی زیادتی کی نسبت سے اس کا حق بھی زیادہ ہو:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ (البقرۃ ۔ ۲ : ۲۲۸)	اور عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔

اس ترجیح کی نوعیت اور اس کے وجوہ کو دوسرے مقام میں یوں واضح کیا ہے کہ چونکہ خاندان کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کی قابلیت اللہ تعالیٰ نے مرد ہی میں رکھی ہے اور اس بنا پر بیوی بچوں کے نفقہ کا قانونی ذمہ دار مرد ہی ہے، عورت نہیں ہے، اس لیے مرد ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کو عورت کا سردار اور قوام بنایا جائے۔ فرمایا:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ (النسآء ۔ ۴ : ۳۴)	مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے، اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے۔ پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی، رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے۔

اس نظریہ کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ عورتوں کو بھی وراثت میں مردوں کے برابر

حصّہ دیا جائے، جیسا کہ اس نظریہ پر ایمان رکھنے والے بعض مسلمان ممالک مثلاً ترکیہ میں قانوناً اس کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، خاندان میں نفقہ کی اصل ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے، اس لیے اس نے وراثت میں مرد کو عورت کا دوگنا حصّہ دیا ہے:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِىٓ أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ (النسآء۔ ۴:۱۱)	اللہ تمہاری اولاد کے باب میں تمہیں ہدایت دیتا ہے کہ لڑکے کا حصّہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

اسی طرح مساوات کا یہ نظریہ مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے سکتا ہے اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ جب چاہے مرد کو طلاق دے سکے۔ چنانچہ ترکیہ میں عورت کو یہ حق بخشا جا چکا ہے اسلام نے عورت کو مرد کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لیے ضروری تحفظات تو ضرور رکھے ہیں، لیکن خاندان کے نظام کو مستحکم رکھنے کے لیے عقدۂ نکاح کے بست و کشاد کا حق صرف اس کو دیا ہے جس کو اس نے قوام بنایا ہے:

أَوْ يَعْفُوَ الَّذِى بِيَدِهِۦ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَن تَعْفُوٓا۟ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنسَوُا۟ الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ (البقرۃ۔ ۲: ۲۳۷)	یا وہ اپنا حق چھوڑے جس کے ہاتھ میں سرشتۂ نکاح ہے اور یہ کہ تم اپنا حق معاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو۔

عام بشری فرائض میں بھی اس نظریہ کے بالکل خلاف اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان فرق کیا ہے اور عورت کو ذمہ داریوں سے الگ رکھا ہے اور اگر ناگزیر حالات میں کوئی بوجھ اس پر ڈالا بھی ہے تو اس کے فطری ضعف کا اعتبار کر کے اس

کے کسر کا جبر مہیا کیا ہے :

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۔

اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرا لو ۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی ۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں ۔ دو عورتیں اس لیے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی ۔

(البقرۃ - ۲ : ۲۸۲)

اس نظریہ کے بموجب تمام مدنی و سیاسی حقوق و فرائض میں عورت کو بھی مرد کے دوش بدوش حصہ لینے کا پورا حق ہے ۔ تمام اجتماعی سرگرمیوں میں اس کو مردوں کے برابر برابر حصہ لینے کی آزادی ہونی چاہیے ۔ ملازمتوں میں خواہ سول ہوں یا فوجی، اس کی پوری نمائندگی ہونی چاہیے ، دوسری تمام سیاسی سرگرمیوں میں بھی اس کی شرکت پر کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے ۔ لیکن اسلام اس کے برعکس معاشرت و تمدن کی دوسری ضروری اور اہم خدمات کے لیے عورت کو ان جھمیلوں سے الگ رکھنا چاہتا ہے اور ان کاموں میں اس کی شرکت کو خود ان کاموں کے لیے بھی ضرر رساں قرار دیتا ہے اور ان دوسرے مقاصد کے لیے بھی نقصان دہ خیال کرتا ہے جو پوری خوش اسلوبی کے ساتھ صرف عورت کے ہاتھوں ہی انجام پا سکتے ہیں ۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

اسلام کے قانون کی رو سے عورت نماز میں مردوں کی امام نہیں ہو سکتی اور اگر کسی مرد کی اقتداء میں وہ نماز ادا کرے تو اس کے لیے بھی بعض شرطیں ہیں جن کا اہتمام ضروری ہے ۔ اس حکم کی وجہ عورت کی کمتری یا مرد کی فضیلت نہیں ہے ۔ بلکہ یہ سرتاسر

اسلام کے اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے ۔ عورت کی فطری و جنسی خصوصیات اور مرد کے جنسی میلانات کی وجہ سے عورت کی امامت میں یہ کھلا ہوا اندیشہ ہے کہ نماز کا وہ اخلاقی اور روحانی مقصد ہی فوت ہو جائے جس کے لیے نماز فرض کی گئی ہے ۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ۔

اسلامی قانون کی رو سے عورت مجسٹریٹ اور جج وغیرہ بھی نہیں بن سکتی[1] بعض فقہاء نے اگر اس کی اجازت دی بھی ہے تو بہت سے مستثنیات اور شرائط کے ساتھ ۔ اس کی بنیاد بھی عورت کی حقارت پر نہیں ہے ، بلکہ ان مناصب کی ذمہ داریوں اور ان فرائض کے لحاظ پر ہے جو فطرت نے خاص طور پر عورتوں سے وابستہ کیے ہیں ۔

عورت کی امارت کے متعلق خود حدیث میں یہ تصریح ہے ۔ حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنایا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ :

لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ۔[2]	وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنی زمام کار ایک عورت کے حوالہ کر دی ۔

یہی روایت بخاری میں ایک اور پہلو کی وضاحت کے ساتھ آئی ہے :

عن ابی بکرۃ قال: لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معھم قال: لما	ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ ایک بات جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اس نے مجھے جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہنچایا جب کہ قریب تھا کہ میں اصحاب جمل کے ساتھ شریک جنگ ہو جاؤں ۔ وہ بات یہ

---

1. نیل الاوطار ـ ۸ : ص ۳۰۵
2. جامع الترمذی : کتاب الفتن ، باب ۷۵

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ[1]	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی کہ اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنے تخت پر بٹھایا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فائز المرام نہیں ہو سکتی جو اپنی حکومت ایک عورت کے سپرد کر دے[2]۔

فوج میں عورتوں کی شرکت کا حال یہ ہے کہ احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں بعض مثالیں اگرچہ ملتی ہیں کہ کبھی کبھی بعض عورتیں اپنے شوہروں یا دوسرے عزیزوں کی معیت میں اسلامی فوج کے ساتھ نکلی ہیں لیکن اس نکلنے کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ مدافعت یا جہاد میں حصّہ لینا عورتوں پر بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح مردوں پر فرض ہے۔ اسلام میں فریضۂ جہاد اصلاً اور اوّلاً مردوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو براہِ راست جہاد میں حصّہ لینے کی نہ کبھی دعوت دی اور نہ کبھی ان کی شرکت پر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ عرب کے دستور کے مطابق اگر کچھ خواتین اپنے شوہروں اور عزیزوں کے ہمراہ نکل پڑیں تو ان کو مریضوں کی تیمارداری، زخمیوں کی مرہم پٹی، کھانا پکانے اور اس قسم کی خدمات میں حصّہ لینے کا موقع بھی دیا گیا اور مالِ غنیمت میں سے بھی بطورِ حصّہ کے نہیں بلکہ بطورِ عطیہ کے ان کو کچھ دے دیا گیا۔ لیکن نہ تو عورتیں اپنے عزیزوں کے بغیر کبھی ان غزوات میں نکلیں، نہ ان کو کبھی جنگ میں حصّہ لینے کی دعوت دی گئی، نہ براہِ راست جنگ میں حصّہ لینے کا ان کو موقع دیا گیا، نہ مالِ غنیمت میں ان کو بحیثیت حصّہ دار کے

---

[1] صحیح البخاری: کتاب المغازی، باب ۸۲

[2] جنگِ جمل میں فوج کی اصلی قیادت درحقیقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کر رہی تھیں۔ ابوبکرہؓ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے۔

شریک کیا گیا اور نہ جنگوں میں ان کی شرکت کی حوصلہ افزائی ہی کی گئی۔ چند صحیح احادیث ملاحظہ ہوں:

عن عائشة، انها قالت يارسول الله نرى الجهاد افضل العمل افلا نجاهد؟ قال: لا، لكن افضل الجهاد حج مبرور[1]۔	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! ہم جہاد کو سب سے زیادہ افضل نیکی سمجھتی ہیں تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا، نہیں۔ بلکہ تمہارے لیے سب سے افضل نیکی حج مقبول ہے۔

صحیح بخاری کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

جهادكن الحج[2]۔	تمہارا جہاد حج ہے۔

ام ورقہ بنت نوفل کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے بدر میں شرکت کی اجازت مانگی تو آپؐ نے ان کو اجازت نہیں دی۔ وہ قرآن کی عالمہ تھیں۔ انہوں نے پھر آپؐ سے اس بات کی اجازت مانگی کہ ان کو نماز اور تعلیم قرآن کے لیے اپنے گھر میں عورتوں کو جمع کرنے کی اجازت دی جائے۔ آپؐ نے ان کو اس بات کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محلہ کی عورتیں ان کے ہاں جمع ہوتیں اور وہ ان کی امامت کرتیں[3]۔

پردہ کے احکام نازل ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حوصلۂ شرکت جہاد کے خلاف ناراضگی کا اظہار بھی کر دیا تھا تاکہ یہ نے زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ چنانچہ غزوۂ خیبر سے متعلق یہ روایت ملتی ہے:

عن حشرج بن زياد عن جدته ام	حشرج بن زیاد اپنی دادی سے روایت کرتے

1۔ صحیح البخاری: کتاب الجهاد والسیر، باب ۱

2۔ صحیح البخاری: کتاب الجهاد والسیر، باب ۶۲

3۔ سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب ۶۱

ابيه انها خرجت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فى غزوة خيبر سادس ست نسوة فبلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم فبعث الينا فجئنا فرأينا فيه الغضب. فقال مع من خرجتن و باذن من خرجتن؟ فقلنا يا رسول الله خرجنا نغزل الشعر ونعين فى سبيل الله و معنا دواء الجرحى ونناول السهام ونسقى السويق. قال: قمن. حتى اذا فتح الله عليه خيبر اسهم لنا كما اسهم للرجال فقلت لها: يا جدة وما كان ذلك قالت تمرا۔[1]	ہیں کہ وہ غزوۂ خیبر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلیں۔ پانچ عورتوں کے ساتھ چھٹی وہ تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے نکلنے کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے ہم کو بلا بھیجا۔ ہم حاضر ہوئیں تو ہم نے آپؐ کو غضبناک پایا۔ آپؐ نے پوچھا تم کس کے ساتھ نکلیں اور کس کی اجازت سے نکلیں؟ ہم نے جواب دیا: یا رسول اللہ ہم چلی آئی ہیں، اُون کاتتی ہیں، کچھ اللہ کا کام کرتی ہیں، ہمارے ساتھ کچھ مرہم پٹی کا سامان بھی ہے۔ ہم تیر پکڑا دیں گی، ستو گھول کے پلا دیں گی۔ آپؐ نے فرمایا چلو، واپس جاؤ۔ پھر جب اللہ نے خیبر فتح کرا دیا تو آپؐ نے ہم کو مردوں کی طرح حصہ[2] دیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا چیز تھی۔ تو فرمایا کھجور۔

صدرِ اوّل کی پوری تاریخ میں عملی سیاست میں کسی عورت کے حصہ لینے کی اگر کوئی قابلِ ذکر مثال ملتی ہے تو وہ صرف اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ملتی ہے۔ انھوں نے حضرت عثمان غنیؓ کے خون کا مطالبہ کیا اور اس کے نتیجہ میں حضرت علیؓ سے اُن کا

---

1 سنن ابی داؤد: کتاب الجہاد، باب ۱۵۲

2 حصہ سے مراد یہاں مردوں کی طرح مالِ غنیمت میں حصہ نہیں ہے بلکہ خود ان کے بیان سے واضح ہے کہ کھجوریں وغیرہ ان کو بھی دی گئیں۔

وہ جنگ ہوئی جس کو جنگ جمل کہتے ہیں۔ اس جنگ میں حق پر کون تھا اور کس سے اجتہاد کی غلطی صادر ہوئی، اس امر سے اس موقع پر بحث نہیں ہے۔ ہم صرف اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک عورت کی حیثیت سے اس معاملہ میں پڑنا اُم المؤمنین کے لیے صحیح تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق متعدد صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی رائیں رجال و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن چونکہ وہ ایک فریق کی جانبداری پر محمول کی جا سکتی ہیں اس لیے ہم یہاں ان کو نقل نہیں کریں گے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے پیش کرتے ہیں جو دو پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو اس سارے جھگڑے میں غیر جانبدار رہے اور دوسرا یہ کہ ان کے علم و تقویٰ پر کبھی کسی نے حرف رکھنے کی جرأت نہیں کی۔ روایت ہے کہ انہوں نے صاف صاف کہا کہ حضرت عائشہؓ کے لیے اس معاملہ میں پڑنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھیں۔

ان بیت عائشۃ خیرلھا من ھودجھا۔[1]	حضرت عائشہؓ کا گھر ان کے لیے ان کے ہودج سے بہتر تھا!

حضرت علیؓ اس معاملہ میں فریق کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگ ان کی رائے کو زیادہ وزن نہ دیں۔ لیکن نازک سے نازک حالات کے اندر انہوں نے جس طرح اپنے سخت سے سخت مخالفوں کے مقابل میں اپنے آپ کو جذبات کی رَو میں بہنے سے بچایا ہے اور جس طرح قول و فعل دونوں میں حق و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے یہاں تک کہ جنگ جمل کے فتنہ میں انتہائی مشکل حالات کے اندر جس طرح خود اُم المؤمنین کے مرتبہ کا انہوں نے لحاظ رکھا ہے اس کی بنا پر وہ حق رکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کی رائے کو ایک فریق کی رائے قرار دے کر نظرانداز

[1] الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ ص ۵۹

نہ کیا جائے، بلکہ دوسرے تمام معاملات میں ان کی رایوں کو جو دینی و شرعی وقعت دی جاتی ہے اسی احترام کے ساتھ اس معاملہ میں بھی ان کی رائے پر غور کیا جائے او دیکھا جائے کہ وہ کس پہلو سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اس اقدام کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو اس بارہ میں جو خط لکھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

اما بعد فانك خرجت غاضبة لله ولرسوله تطلبين امرا كان عنك موضوعا۔ مابال النساء والحرب والاصلاح بين الناس، تطلبين بدم عثمان؟ ولعمري لمن عرضك للبلاء وحملك على المعصية اعظم اليك ذنبا من قتلة عثمان وما غضبت حتى اغضبت وما هجت حتى هيجت فاتقى الله وارجعي الى بيتك[1] ۔	آپ اللہ و رسولؐ کی حمیت میں ایک ایسے مطالبہ کرنے کو اٹھ پڑی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ اللہ و رسولؐ کی جانب سے سبکدوش تھیں۔ عورتوں کو جنگ اور مردوں کے معاملات میں پڑنے سے کیا تعلق؟ آپ عثمانؓ کے خون کا مطالبہ لے کر اٹھی ہیں، حالانکہ اللہ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو اس آزمائش میں مبتلا کیا اور اس غلطی پر آمادہ کیا، انہوں نے عثمانؓ کے قاتلوں سے بڑی برائی آپ کے ساتھ کی۔ آپ دوسروں کے ابھارنے سے غصہ میں آگئی ہیں اور دوسروں کی انگیخت سے آپ میں اشتعال پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ سے خوف کیجیے اور گھر کو لوٹ جائیے!

ملاحظہ فرمائیے، اس خط میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نفس معاملہ کے حق یا باطل ہونے پر کوئی بحث نہیں کرتے اور اُمّ المؤمنین سے یہ نہیں کہتے کہ آپ ایک بالکل غلط معاملہ کے لیے اٹھ پڑی ہیں اور اس کے غلط ہونے کے دلائل یہ اور یہ ہیں، جیسا کہ انہوں نے اپنے دوسرے مخالفوں کو لکھا۔ بلکہ اُمّ المؤمنین پر ان کو جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے معاملہ میں براہ راست اور عملی مداخلت کی

[1] الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبۃ: ج ۱ ص ۷۰-۷۱

ہے جس کی ذمہ داریوں سے، ایک عورت ہونے کی حیثیت سے، اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کو بری کیا تھا، لیکن محض دوسروں کی انگیخت سے وہ ایک غیر متعلق معاملہ میں پڑ گئی ہیں اور ایک بڑے فتنہ کی ذمہ داریوں میں اپنے آپ کو الجھا دیا ہے، جن سے بغیر کسی مسئولیت کے وہ اپنے تئیں علیٰحدہ رکھ سکتی تھیں۔

اُمّ المؤمنین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس خط کا جو جواب دیا وہ محض اس قدر تھا کہ 'اب گلہ شکوہ کا وقت نہیں رہا'! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے اعتراض کی قوت محسوس کی اور اس سے متاثرؓ بھی ہوئیں لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان کے لیے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینا ناممکن ہو چکا تھا، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس موقع پر اس مختصر جواب پر قناعت کر جاتیں اور حضرت علیؓ کے اس دعویٰ کو چیلنج نہ کرتیں کہ اس طرح کے معاملات عورتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ عورتوں کے حقوق کے لیے زندگی بھر وہ جس طرح لڑتی رہی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود وہ اس کی تردید نہ کریں۔ ان کے تاثرؓ کی شہادت ان کی بعد کی پوری زندگی سے بھی ملتی ہے۔ کیونکہ جنگِ جمل کے بعد سیاسی فتنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد سے اُمّ المؤمنین نے اپنی ساری اصلاحی سرگرمیاں عورتوں تک محدود رکھیں اور نہ صرف یہ کہ کسی عام سیاسی ہنگامہ میں کسی نوعیت سے حصّہ نہیں لیا، بلکہ مختلف دلائل و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جنگِ جمل کی غلطی پر ان کو مدّت العمر پچھتاوا رہا۔

مغربی نظریۂ مساوات کے قائلوں سے گزارش:

یہ چند باتیں محض بطورِ مثال پیش کی گئی ہیں اور دکھانا یہ مقصود ہے کہ مغربی

نظریۂ مساوات اور اسلامی نظریۂ مساوات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر آپ مغربی نظریۂ مساوات کو لے کر 'اسلامی نظام' بنانے چلیں گے تو قدم قدم پہ خود اسلام ہی سے آپ کی لڑائی ہوگی۔ آپ کس کس چیز کو مُلّائیت قرار دیں گے؟ کس کس بات کو فقیہوں اور مولویوں کا مذہب بتا کر رد کرنے کی کوشش کریں گے؟ کتنی جگہوں پر خود اپنی آنکھیں بند کریں گے اور کتنے مقامات پر دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھیں گے؟ مانا کہ آپ ایک انوکھا نظام بنائیں گے، لیکن آخر وہ کتنا انوکھا ہوگا کہ مغربی نظریۂ مساوات پر بھی مبنی ہوگا اور اسلام پر بھی مبنی ہوگا؟ اس ملک کے عوام جاہل سہی اور آپ بڑے ماہرِ فن سہی مگر اپنی قوم کے متعلق آپ کا یہ گمان کہ وہ بالکل ہی عقل اور علم سے کوری ہے، شاید صحیح نہ ثابت ہو۔

ہمارے نزدیک تو اس قسم کی کوشش کا نتیجہ ایک سخت ذہنی انتشار اور فکری خلفشار کے سوا اور کچھ نہیں نکلے گا۔ لوگ جب اسلام اسلام کی پکار کے ساتھ ہر قدم پر کھُلّم کھُلّا اسلام کُشی کے دردناک مناظر دیکھیں گے تو ممکن نہیں ہے کہ اس کا ردِعمل نہایت افسوسناک شکل میں ظاہر نہ ہو۔ اس لیے سیدھا راستہ تو یہ ہے کہ جس اسلام کا آپ نام لیتے ہیں اس میں یکسو ہو جائیے اور معاشرہ کی تربیت بھی اسی کے اصولوں پر کیجیے اور سیاسی نظام بھی اسی کے اصولوں پر بنائیے۔ لیکن اگر اس کی ہمت یا اس کا علم آپ میں نہیں ہے، یا یہ آپ کے نفس کی خواہشات کے خلاف ہے تو پھر شریفانہ طریقہ یہ ہے کہ راہ کا پتھر نہ بنیے اور ان لوگوں کو کام کرنے کا موقع دیجیے جو اسلام پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسلام کا علم بھی رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ بات بھی منظور نہیں تو پھر تیسرا راستہ آپ کے لیے یہ ہے کہ اتاترک اور ان کے ساتھیوں کی طرح اپنے بل بوتے پر ــــ اسلام کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر نہیں ــــ میدان میں آئیے اور انہی کی طرح پوری جرأت کے ساتھ اعلان کیجیے کہ ہمیں اسلام و مسلام

کچھ نہیں چاہیے۔ ہم مغربی حکومتوں کے طرز پر ایک لادینی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس میں عورتوں کو اسی طرح مطلق العنان رکھنا چاہتے ہیں جس طرح وہ یورپ کی لادینی ریاستوں میں ہیں! انہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی خلق اور خالق کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ دنیا کی نجات اگر ہے تو بس اسلام ہی کے اندر ہے اور ہم دنیا کو پھر ایک صحیح اسلامی حکومت کا جلوہ دکھانے کے لیے اٹھے ہیں۔ انہوں نے ایک لمحہ کے لیے قرآن کا بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے اعتراف نہیں کیا اور کبھی قرآن اور سنّت کی تعلیمات کو پارہ پارہ کر دینے والی حرکتوں کا افتتاح قرآن کی تلاوت سے کر کے اللہ کے غضب کو بلاوے بھیجنے کی جسارت[1] نہیں کی بلکہ صاف صاف لادینیت، کا اعلان کیا اور قرآن کو الگ رکھ کر جرمنی، اٹلی

---

[1] کچھ دن پہلے کراچی میں جنگ کا اور لاہور میں فلم کمپنی کا افتتاح قرآن مجید کی تلاوت سے ہو چکا ہے۔ اب ۲۵۔ فروری ۱۹۵۰ء کے ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں پاکستانی اولمپک گیمز کی تقریب افتتاح کی تفصیلات اور پھر اس سلسلہ کی تصویریں ملاحظہ ہوں۔ اس تقریب مبارک کا افتتاح بھی تلاوتِ قرآن مجید سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کھلاڑیوں کا مارچ پاسٹ ہوتا ہے، جس میں نوجوان مرد کھلاڑیوں کے پہلو بہ پہلو لڑکیاں بھی نکر لنگوٹ کسے ہوئے موجود ہیں۔ آنریبل مسٹر غلام محمد نے سلامی لی اور اپنی تقریر میں اس امر پر دلی خوشی کا اظہار فرمایا کہ الحمدللہ کھلاڑیوں کے پہلو بہ پہلو کھلاڑنیں بھی موجود ہیں اور امید ہے کہ آئندہ ان کی تعداد میں حسبِ لخواہ اضافہ ہوگا۔ ان حرکتوں کے بعد اگر کچھ کسر رہ گئی ہے تو بس یہ کہ شراب نوشی کی محفل میں بادہ نوشی شروع کرنے سے پہلے قرآن کی وہ آیات تلاوت کر لی جایا کریں جن میں شراب کی حرمت کا ذکر آیا ہے۔ اور بدکاری کے اڈوں میں فواحش کا ارتکاب کرنے سے پہلے ان آیات کو پڑھ لیا جایا کرے جن میں زنا کی سزا بیان ہوئی ہے تاکہ خدا کا غضب جتنا عام زانیوں اور شرابیوں پر بھڑکتا ہے اس سے دس گنا ان لوگوں پر بھڑکے جو اس کے احکام کی نافرمانی کرنے سے پہلے اعلان کریں کہ ہاں ہم خدا کو بھی جانتے ہیں اور اس کے احکام کو بھی جانتے ہیں، مگر نہ ہمیں خدا کی پروا ہے نہ اس کے احکام کی۔ وہ اگر کوئی ہمت رکھتا ہے تو ہم پہ ہاتھ ڈال کر دیکھے! (العیاذ باللہ)

اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ ممالک کے قوانین میں سے جس جس کو اپنی ہوائے نفس کے موافق پایا اس کو اپنا لیا اور اگر کسی نے ان کے اس کام میں مزاحمت پیدا کرنے کی کوشش کی تو اس کو انہوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ پس اگر آپ کو کام وہی کرنا ہے جو انہوں نے کیا ہے، تو پھر اس کام کو اسی طرح کیجیے جس طرح انہوں نے کیا ہے اور یہ منافقانہ روش چھوڑیے، جو نہ تو دُنیا میں سرخروئی کا باعث ہوگی نہ آخرت میں۔

باب ۳

پردہ

پردہ کے متعلق جو خیالات یہ حضرات ظاہر کرتے ہیں پچھلے اوراق پر دوبارہ ایک نظر ڈال کر ان خیالات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ پردہ محض مولویوں کی ایک ایجاد ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں ہے۔ بعض جری ان میں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے پردہ ایجاد کیا وہ خود اخلاقی اعتبار سے گھٹیا درجہ کے لوگ تھے۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اپنی اصلاح کرتے، عورتوں کو پردہ کے پیچھے دھکیل دیا اور اس کو اپنی کمزوری کا علاج سمجھا۔ اس گروہ میں جو تحقیق کے مدعی ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں پردہ کا کوئی وجود سرے سے تھا ہی نہیں، اس زمانہ میں عورتیں آزادانہ باہر پھرتی تھیں۔ شاعروں اور گویوں کی محفلیں جما کر شمع انجمن بن کر بیٹھتی تھیں۔ نت نئے فیشن ایجاد کر کے پبلک میں اپنی جمال آرائیوں سے ان کو حسن قبول بخشتی تھیں۔ اس دعوی کے ثبوت میں وہ حضرت حسینؓ کی صاحبزادی سکینہ اور حضرت ابوبکرؓ کی نواسی عائشہ کا نام لیتے ہیں اور ان کے سہارے پر دعویٰ کرتے ہیں کہ عہد نبوت اور عہد صحابہ کی اصلی تہذیب یہی تھی۔ پردہ کے ابتدائی رواج کے متعلق ان کا بیان ہے کہ عباسی خلفا کے دور آخر میں جب لوگوں کی اخلاقی حالت بہت گر گئی، نہ مردوں پر اعتماد باقی رہ گیا نہ عورتوں پر تو لوگ مجبور ہوئے کہ عورتوں کو چہار دیواریوں کے اندر بند کر دیں۔

ان خیالات کو سامنے رکھ کر ہم کو متعدد سوالات پر غور کرنا ہے: کیا فی الواقع قرآن و حدیث میں پردہ کی بابت کوئی حکم موجود نہیں ہے اور یہ محض مولویوں کی

دھاندلی ہے جو انہوں نے لوگوں پر چلا رکھی ہے ؟ کیا پردہ پچ مچ ایسے ہی لوگوں کی ایجاد ہے جو اخلاقی اعتبار سے گھٹیا درجہ کے لوگ تھے اور انہوں نے محض اپنی اخلاقی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے یہ پردہ ایجاد کیا ہے ؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ میں عورتوں کی زندگی فی الحقیقت اسی طرز کی تھی جس طرز کی زندگی یہ لوگ سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ؟ ہم ان تمام سوالوں پر غور کریں گے۔ لیکن ان پر الگ الگ گفتگو کرنے کے بجائے ایک ہی سلسلہ میں اس طرح بحث کریں گے کہ ناظرین کو ہر سوال کا جواب بھی پوری وضاحت کے ساتھ مل جائے اور بحث میں زیادہ طوالت بھی پیدا نہ ہونے پائے۔

پردہ سے متعلق مسائل کی تفصیل قرآن و حدیث میں :

جس شخص نے قرآن مجید اور احادیث کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہوگا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے معاشرتی مسائل میں سے جو مسائل زیادہ سے زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ قرآن مجید اور احادیث میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ پردہ کا مسئلہ بھی ہے۔ جس طرح نکاح، طلاق وغیرہ کے تمام اصولی مسائل قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں اور پھر ان کی ضروری تفصیلات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمادی ہیں اسی طرح پردہ سے متعلق تمام اصولی ہدایات خود قرآن مجید میں وارد ہیں اور ان کی ضروری توضیحات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں۔ اس وجہ سے پردہ کو محض مولویوں کی ایجاد قرار دینا یا تو بدترین قسم کی جہالت ہے یا بدترین قسم کی منافقانہ جسارت۔ رہے وہ حضرات جو اس کو اخلاق سے گرے ہوئے لوگوں کی ایجاد بتاتے ہیں وہ آگے کے مباحث ملاحظہ فرمانے کے بعد بہتر طریق پر اندازہ کر سکیں گے کہ جن لوگوں کو وہ اخلاقی اعتبار سے گرا ہوا قرار

دیتے ہیں وہ کون ہیں اور ان کا اخلاقی پایہ کیا ہے۔

عورت کا اصلی میدان عمل :

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس اصولی مسئلہ کو لیجیے کہ اللہ و رسول نے عورت کے لیے اصلی میدان عمل کون سا تجویز فرمایا ہے : گھر سے باہر یا گھر کے اندر یا گھر کے اندر اور باہر دونوں ؟ اس سوال کا نہایت واضح جواب ہمیں قرآن مجید کی اس آیت سے ملتا ہے :

وَقَرْنَ فِی بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ	اور اپنے گھروں میں ٹک کے رہو اور سابقہ
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ	جاہلیت کے سے انداز اختیار نہ کرو۔ اور نماز
الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَاَطِعْنَ	کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ط	اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

(الاحزاب ـ ۳۳ : ۳۳)

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نکلتی ہیں :

ایک یہ کہ عورت کا اصلی میدان عمل اس کا گھر ہے نہ کہ باہر۔ اس لیے بغیر کسی حقیقی ضرورت کے اس کا غیر متعلق کاموں میں شرکت کے لیے نکلنا یا سیر سپاٹے، تفریح، تماشہ بینی اور پکنک کے لیے جانا یا اپنے حسن و جمال اور بناؤ سنگھار کی نمائش کرتے پھرنا ناجائز ہے۔

دوسری یہ کہ اسلام کے ظہور سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کی باتیں عورتوں میں پائی جاتی تھیں جن کو اسلام نے آ کر مٹایا ہے۔ اس لیے اسلام کا پسندیدہ کردار ایک عورت کے لیے وہی ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے اور اسی کردار کی مسلمان عورتوں کو تعلیم دی گئی ہے۔ اگر اس کردار کے خلاف کوئی بات کسی مسلمان عورت

میں پائی جائے گی، تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے ترقی کی ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے زمانۂ جاہلیت کے کردار کی طرف رجعت کی ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں اگرچہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہیں لیکن یہ ہدایت اُن کو مخاطب کرکے اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ یہ انہی کے ساتھ مخصوص ہے، بلکہ اس لیے ان کو مخاطب کیا گیا ہے کہ وہ تمام امت کی عورتوں کے لیے نمونہ ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بعینہٖ یہی ہدایات جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، عام عورتوں کے لیے بھی قرآن مجید میں نازل ہوئی ہیں۔ نیز اس آیت ہی کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام عورتوں کو ایسی ہدایات دیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل دائرۂ عمل گھر ہے نہ کہ گھر سے باہر۔

ایک مشہور حدیث میں، جس میں معاشرہ کے مختلف طبقات کی ذمہ داریوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ الگ گنایا ہے، عورت کی اصل ذمہ داری یہ بیان فرمائی ہے:

والمرأة راعية على بيت	اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں
بعلها وولده وهي	کی نگران بنائی گئی ہے اور اس سے ان
مسئولة عنهم[1]	چیزوں کی بابت پرسش ہوگی۔

باہر کے اجتماعی فرائض میں سے اور کاموں کا تو کیا ذکر، جو کام نیکی و پاکیزگی اور خدمت دین و ہمدردیٔ خلق کے بہترین کام ہیں، ان میں بھی عورت کی شرکت کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ جہاد اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے والی سب سے بڑی نیکی ہے، لیکن حضرت ام ورقہ بنتِ نوفلؓ نے غزوۂ بدر میں شرکت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ۵۔

مانگی تو آپ نے فرمایا: قِرِّی فِی بَیْتِکِ[1] (جاؤ، اپنے گھر بیٹھو!) اس سے معلوم ہوا کہ اگر عورتوں کی جنگ میں شرکت کسی حد میں بھی کوئی پسندیدہ کام ہوتا تو غزوۂ بدر سے بڑھ کر ضرورت کا موقع اور کون سا آ سکتا ہے۔

نماز تمام اجتماعی کاموں میں سب سے زیادہ پاکیزہ اور اعلیٰ کام ہے اور چند شرائط کے ساتھ عورتوں کو نماز باجماعت میں شرکت کی اجازت بھی دی گئی ہے، لیکن اس اجازت کے ساتھ ساتھ یہ تصریح بھی موجود ہے کہ وبیوتھن خیر لھن[2] (ان کے گھر ان کے لیے مسجدوں سے زیادہ بہتر ہیں)۔

نمازِ جمعہ اسلام کی اجتماعی زندگی میں جو اہمیت رکھتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم ہے کہ عورتوں پر نمازِ جمعہ واجب نہیں ہے:

الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ الا اربعۃ: عبد مملوک، او امراۃ، او صبی، او مریض[3]	جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے مگر چار شخص مستثنیٰ ہیں: غلام، عورت، بچہ اور مریض۔

جنازہ کی مشایعت انسانی و اسلامی ہمدردی کے اعلیٰ ترین کاموں میں سے ہے۔ لیکن عورتوں کو اس سے بھی روکا گیا ہے:

عن ام عطیۃ، قالت: نُہِینا عن اتباع الجنائز[4]۔	حضرت اُم عطیہؓ سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ ہم کو جنازوں کے ساتھ جانے سے روکا گیا ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء
[2] سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی خروج النساء الی المسجد
[3] سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ
[4] صحیح البخاری: کتاب الجنائز، باب اتباع النساء والجنائز

ان واضح ہدایات کے بعد کون شخص اس میں شک کر سکتا ہے کہ اسلام نے عورت کے لیے اصلی دائرۂ عمل اس کے گھر کو ٹھہرایا ہے :

عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کی ممانعت :

ہمارے لیڈر حضرات دھکیل دھکیل کر عورتوں کو گھروں سے باہر لا رہے ہیں۔ ہر کلب اور ہر انجمن میں، ہر معاشرتی اور ہر سیاسی تقریب میں، ہر جلسہ اور ہر کانفرنس میں، ہر کھیل اور ہر تماشا میں عورتوں کو مردوں کے بالکل برابر کر دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے اور اگر کسی تقریب میں عورتوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے تو اس کا غم منایا جاتا ہے کہ عورتوں کی کمی کے بقدر اسلامی تہذیب و ثقافت کے مظاہرہ میں کمی رہ گئی۔ لیکن اسلام نے عورتوں اور مردوں کے عام میل جول کی صریح الفاظ میں ممانعت فرمائی ہے۔ اس بارہ میں قرآن مجید کی اصولی ہدایت یہ ہے :

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا	اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں نہ داخل
بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ	ہو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی دعوت
اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ	دی جائے۔ نہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی
وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا	تیاری کا۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے تو داخل
طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ	ہو، پھر جب کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور
اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ	باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو۔ یہ باتیں
وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا	نبی کے لیے باعث اذیت تھیں لیکن وہ تمہارا
سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ	لحاظ کرتے تھے اور اللہ حق کے اظہار میں کسی
مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ	کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور جب تم کو ازواج نبی
اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ	سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو،

ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ؕ
(الاحزاب ۳۳ : ۵۳)

یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط ان کا ایک مجلس میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا، دعوتوں میں باہم مل جل کر کھانا پینا، تفریحات میں ایک ساتھ شریک ہونا اسلام کی تہذیب نہیں ہے۔ یہ آیت بھی اگرچہ ظاہر الفاظ کے لحاظ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج سے متعلق معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ان ہی سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ بعینہٖ یہی ہدایات خود قرآن مجید کے اندر پوری اسلامی سوسائٹی کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ نیز قرآن کی انہی تعلیمات کی بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر ایسی ہدایات جاری فرمائی ہیں جن کا مقصد مسلمان عورتوں اور مردوں کو عام اختلاط سے روکنا تھا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

عن حمزہ بن ابی اسید الانصاریؓ عن ابیہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول وھو خارج من المسجد فاختلط الرجال مع النسآء فی الطریق، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للنسآء: استأخرن؛ فانہ لیس لکن ان تحققن الطریق، علیکن بحافات الطریق۔ فکانت المرأۃ تلتصق بالجدار حتی ان

حمزہ بن ابو اُسید انصاری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکل رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ راستہ میں مرد عورتوں کے ساتھ رل گئے ہیں۔ آپ نے عورتوں سے فرمایا کہ تم پیچھے ہو جاؤ، تمہارے لیے راستہ کے بیچ میں چلنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم راستہ کے کنارہ سے چلو۔ چنانچہ اس حکم کے بعد عورتیں بالکل دیوار سے لگ جاتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی چادریں

فربها التعلق بالجدار من لصوقها بہ۔ دیوار سے الجتی تھیں۔

روایات میں آتا ہے کہ نماز سے فارغ ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر ٹھہر جاتے کہ عورتیں نکل جاتیں تاکہ راستہ میں عورتوں اور مردوں کا تصادم نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کا ایک دروازہ عورتوں کے لیے خاص کر دیا تھا[2]۔

عیدین کی نمازوں میں عورتوں کو شرکت کی خاص طور پر تاکید تھی، لیکن ان کا اجتماع مردوں سے الگ ہوتا تھا[3]۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی مرد دو عورتوں کے درمیان سے چلے[4]۔

اگر مردوں کو عورتوں سے کوئی بات جماعتی حیثیت سے کہنی ہوتی تھی تو اس کے لیے بھی پردہ کا مناسب حال اہتمام کیا جاتا تھا۔

عن ام عطیۃ، ان رسول اللہ	حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے کہ
صلی اللہ علیہ وسلم لما قدم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ
المدینۃ جمع نساء الانصار فی	تشریف لائے تو آپؐ نے انصار کی
بیت فارسل الینا عمر بن الخطابؓ	عورتوں کو ایک گھر میں جمع کیا، پھر عمر بن
فقام علی الباب فسلم علینا فرددنا	خطابؓ کو ہمارے پاس بھیجا، وہ آئے تو آکر
علیہ السلام، ثم قال: انا رسول	دروازہ پر کھڑے ہوئے، پھر ہم کو سلام کیا،

---

1. سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق۔
2. سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال۔
3. سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء فی العید
4. سنن ابی داؤد: کتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق

رسول اللہ الیکن[1]۔ | ہم نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیجا ہوا تمہارے پاس آیا ہوں۔

ان واضح دلائل کے بعد کون شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسلام دونوں جنسوں کے آزادانہ اختلاط کو کسی نوعیت سے بھی جائز رکھتا ہے!

گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں عورت کے لیے ہدایات:

اب وہ صحیح ہدایات ملاحظہ فرمائیے جن کی پابندی کا عورت کو اس صورت میں حکم دیا گیا ہے جب اسے کسی ناگزیر اور اہم ضرورت کے لیے گھر کی چاردیواری سے باہر قدم نکالنا پڑے اور غیر محرموں سے سابقہ پڑنے کا اندیشہ ہو۔ اس بارہ میں قرآن مجید نے جو اصولی ہدایت دی ہے اس میں سورۂ احزاب کی متقدم الذکر دونوں آیتوں کی طرح اس شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں اور بیٹیوں کے لیے خاص ہے بلکہ اس میں اس بات کی صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ تمام مسلمان عورتوں کے لیے عام ہے۔ فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝	اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ ڈال لیا کریں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے۔ بس ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔
(الاحزاب ۳۳: ۵۹)	

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء فی العید

اس آیت میں گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں عورتوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے اوپر جلباب ڈال لیا کریں اور اس جلباب کا کچھ حصہ چہرہ پر لٹکا لیا کریں۔ عربی زبان میں جلباب بڑی چادر کو کہتے ہیں۔ باہر نکلتے وقت معمولی لباس کے اوپر ایک بڑی چادر ڈال لینے کا رواج جس طرح ہمارے دیہات کے شریف گھرانوں کی بڑی بوڑھیوں میں رہا ہے اسی طرح عرب کے باعزت گھرانوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ یہ چادر سر سے پاؤں تک پورے جسم کو چھپا لیتی تھی اور عورت کے لباس، اس کی زینتوں اور اس کے جسم کے محاسن کو ڈھانک لینے کے لیے مروجہ برقعوں سے زیادہ موزوں تھی۔ قرآن مجید نے یہ ہدایت کی کہ گھر سے باہر نکلنے کی نوبت آئے تو عورتیں یہ بڑی چادر اوپر ڈال لیا کریں اور اس کا کچھ حصہ گھونگٹ کی شکل میں چہرہ پر لٹکا لیا کریں۔ اس گھونگٹ کی شکل حضرت عائشہؓ کے ایک بیان سے واضح ہوتی ہے۔ وہ حجۃ الوداع کے موقع کا ذکر کرتی ہوئی فرماتی ہیں:

كان الركبان يمرون بنا ونحن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم محرمات. فاذا حاذوا بنا سدلت احدنا جلبابها من رأسها على وجهها. فاذا جاوزونا كشفناه.[1]	حُجاج کے قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام کی حالت میں تھیں۔ جب قافلے ہمارے سامنے آتے تو ہم سر کی طرف سے بڑی چادر کا کچھ حصہ چہرہ پر لٹکا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو اس کو اُٹھا دیتیں۔

یہی حضرت عائشہؓ واقعۂ افک کے سلسلہ میں بیان فرماتی ہیں کہ جب میں نے صفوان بن معطل کے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے کی آواز سُنی تو فخمرت وجهي بجلبابي[2] (میں نے

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب ۳۴

[2] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب ۳۴

اپنی بڑی چادر سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔)

یہی جلباب ہے جس نے تمدن کی ترقی کے ساتھ ترقی کر کے مختلف قسم کے برقعوں اور نقابوں کی شکل اختیار کی اور مختلف مسلمان ملکوں میں اس کی مختلف شکلوں کا رواج ہوا۔ ان برقعوں اور نقابوں کی بعض اقسام کے متعلق یہ بحث تو ہو سکتی ہے کہ یہ جلباب کے مقصد کو صحیح طور پر پورا کرتے ہیں یا نہیں، لیکن یہ کہنا کہ برقع یا نقاب کا حکم سرے سے اسلام میں ہے ہی نہیں، یہ محض ملاؤں کی ایجاد ہے، ایک ایسی جسارت ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے[1]۔

---

[1] اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں یہ حکم نازل ہوا ہے اس زمانہ میں مدینہ میں منافقوں کا دور تھا اور وہ مسلمانوں کی ایذا دہی کے شوق میں جب موقع پاتے ان کی بہوؤں اور بیٹیوں کو چھیڑنے کے بہانے ڈھونڈتے اور جب ان پر گرفت کی جاتی تو معذرت کر دیتے کہ ہم نے سمجھا کوئی لونڈی ہے۔ اگر ہم جانتے کہ کوئی شریف زادی ہے تو ہرگز اس قسم کی غلطی نہ کرتے۔

اس زمانۂ نزول کو دلیل ٹھہرا کر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ حکم ایک فتنہ کے زمانہ میں ایک عارضی احتیاطی تدبیر کے طور پر دیا گیا تھا جو فتنہ کا زمانہ گزر جانے کے بعد باقی نہیں رہا، تو یہ کہنا مختلف پہلوؤں سے غلط ہو گا۔

اوّلاً یہ کہ قرآن مجید میں جتنے احکام بھی نازل ہوئے ہیں سب ضرورت اور حالات کے تقاضے پر نازل ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر یہ اصول ٹھیرا لیا جائے کہ تمام احکام انہی ضروریات و حالات کے تابع ہیں جو ان کے نزول کے وقت موجود تھے، ان کے بدل جانے کے بعد وہ احکام و قوانین آپ سے آپ بدل جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ قرآن کا بیشتر حصہ بالکل بے مصرف ہو کے رہ جائے گا۔

ثانیاً پردہ کے یہ احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان زمانوں میں بھی بدستور قائم رہے جس زمانہ میں منافقین کا کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا اور مدینہ کی سوسائٹی اشرار اور مفسدین سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ اس زمانہ میں نہ صرف پردہ کا یہ حکم باقی رہا، بلکہ عورتوں کو بعض آزادیاں جو منافقین کی موجودگی کے زمانہ میں حاصل تھیں۔ مثلاً مسجدوں کی حاضری کی آزادی، اُن کے متعلق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اب عورتوں کے حالات میں جو تغیر ہو گیا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھتے تو ان کو مسجدوں کی حاضری سے روک دیتے۔

ثالثاً یہ حکم جس زمانہ میں نازل ہوا ہے اس زمانہ میں مدینہ کی سوسائٹی ان منافقین کے باوجود صالح ترین سوسائٹی تھی۔ ایسی صالح کہ ایسی صالح سوسائٹی چشم فلک نے شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ اس سوسائٹی کے اندر اگر کچھ منافقین موجود تھے بھی تو اوّلاً تو ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ آسانی سے ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ ثانیاً بلکہ صالح نظام کے قائم ہو جانے کی وجہ سے وہ اگر اس طرح کی کوئی مجرمانہ حرکت کرتے بھی گزرتے تھے۔ ـــــ

قرآن مجید کے اس حکم کے بعد اب ملاحظہ فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں عورتوں کو ضمنی ہدایات کیا دیں اور روزمرہ کی عملی زندگی پر مسلمان بیبیوں نے کس طرح بے چون وچرا ان ہدایات کی تعمیل کی۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد اسلامی سوسائٹی میں جو فوری تغیر نمایاں ہوا اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل روایت سے ہو سکے گا:

عن ام سلمة قالت: لما نزلت يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ خرج نساء الانصار كان على رؤوسهن الغربان من الاكسية۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب قرآن میں وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ ڈال لیا کریں کا حکم نازل ہوا تو انصار کی عورتیں اس طرح نکلیں کہ معلوم ہوتا تھا چادروں کے ڈالنے کی وجہ سے ان کے سروں پر کوّے بیٹھے ہوئے ہیں۔

ایک دوسری روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن غم انگیز حالات کے اندر عام عورتیں دوہتڑ مارتی، سینہ پیٹتی اور گریبان چاک کرتی ہیں، اس حکم کے نزول کے بعد مسلمان خواتین ان حالات کے اندر بھی اس حکم کا احترام قائم رکھتی تھیں، ملاحظہ ہو:

جاءت امرأة الى النبى صلى الله

ایک خاتون جن کا نام ام خلاد تھا آنحضرت

= تو ہر وقت اس کی سخت ترین پاداش کے خوف سے کانپتے بھی رہتے تھے۔ پھر جب ایسی سوسائٹی میں پردہ کا حکم مزید بھی گیا تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری اس سوسائٹی میں اس کی کس قدر ضرورت ہوگی جس کا حال یہ ہے کہ اس کے اندر شاید مخلصین کی تعداد اتنی بھی نہ ہو جتنی اس سوسائٹی میں منافقین کی تھی اور قانون اور نظام کا حال یہ ہے کہ اس نظام کے اندر سب کے لیے آزادی اور سب کے لیے امان ہے، اگر امان اور آزادی نہیں ہے تو ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو نیکی اور پاکبازی کی زندگی خود بسر کرنا چاہتے ہوں اور اس کی دعوت دوسروں کو بھی دینے کی جرأت کریں۔

ل سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قوله تعالیٰ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ

عليه وسلم يقال لها ام خلاد وهي منتقبة تسأل عن ابنها وهو مقتول فقال لها بعض اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم: جئت تسألين عن ابنك وانت منتقبة؟ فقالت: ان ارزأ ابني فلن ارزأ حيائي. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ابنك له اجر شهيدين. قالت: ولم ذاك يا رسول الله (صلى الله عليه وسلم)؟ قال: لانه قتله اهل الكتاب۔[1]

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے بیٹے کا جو مقتول ہو چکا تھا، انجام دریافت کرنے آئیں اور وہ نقاب پہنے ہوئے تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے ان کی اس مستقامت پر تعجب کرتے ہوئے کہا: نقاب پہن کے آپ بیٹے کا حال دریافت کرنے آئی ہیں؟ یعنی یہ موقع تو گریہ وبکا کرنے اور سر پیٹنے کا تھا۔ انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ میرا بیٹا مرا ہے میری حیا نہیں مری ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ تمہارے بیٹے کو دو شہیدوں کا اجر ملے گا۔ انہوں نے پوچھا: ایسا کیوں، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ اس کو اہل کتاب نے قتل کیا ہے۔

نمازِ عید میں عورتوں کو شرکت کی تاکید تھی اور اس حکم کے بعد اب باہر نکلنے کی صورت میں جلباب کا استعمال بھی ہر عورت کے لیے ضروری قرار پا گیا۔ اس وجہ سے ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اگر کسی عورت کے پاس بڑی چادر موجود نہ ہو اور وہ نمازِ عید کے لیے نہ نکلے تو کچھ حرج تو نہیں ہے؟ یہ سوال دو مختلف پہلوؤں سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں عام طور پر مسلمان غریب تھے۔ دوسرا یہ کہ کپڑا بجائے خود عرب میں ایک بڑی کمیاب چیز تھا۔ لیکن ملاحظہ فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ سوال آیا تو آپ

---

[1] - سنن ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب فضل قتال الروم علی غیرہم من الامم

نے اس کا کیا جواب دیا:

فقالت، یارسولَ اللّٰہ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم)! أعلی احدانا باس اذالم یکن لھا جلباب ان لا تخرج؟ فقال: لتلبسھا صاحبتھا من جلبابھا فلیشھدن الخیر ودعوۃ المسلمین[1]۔	ایک خاتون نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! اگر ہم میں سے کسی کے پاس بڑی چادر نہ ہو اور وہ عید کی نماز میں نہ شریک ہو تو کیا کچھ حرج ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کی کوئی دوسری بہن اس کو اپنے جلباب میں شریک کرے اور اس طرح وہ اس بھلائی کے کام اور مسلمانوں کی اس اجتماعی دعا میں شریک ہوں۔

بہت سے حضرات اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو پوری آرائش جاہلی کے ساتھ باہر پھراتے ہیں اور زندگی میں کبھی کسی اقتصادی مشکل یا کپڑے کی کمیابی کے دُکھ سے آشنا نہیں ہوئے۔ لیکن جب پردے کے مسئلہ پر اظہارِ خیال فرماتے ہیں تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر برقع یا چادر باہر نکلنے کے لیے ہر عورت کے واسطے ضروری چیز قرار دے دی جائے تو ایک غریب عورت کہاں سے اس کا بندوبست کر سکے گی؟ گویا انہوں نے بے پردگی کی یہ زندگی اپنی بیگمات کے لیے جو لپسند کی ہے تو اس کی وجہ محض غُربا کی ہمدردی اور ان کے ساتھ مشارکت ہے، ورنہ وہ تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس بے پردگی کو گوارا نہ کریں! اس طرح کی اقتصادی مشکلات میں پھنسے ہوئے حضرات اس حدیث سے معلوم کر سکتے ہیں کہ غربا کی جس مشکل کو وہ اپنی ہوائے نفس کے لیے بہانہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں وہ مشکل ایک سوال کی صورت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہو چکی ہے اور ایسے زمانہ میں پیش ہو چکی ہے جس زمانہ سے زیادہ شاید ہی کبھی اس مشکل

---

[1] صحیح البخاری، کتاب العیدین، باب اذا لم یکن لھا جلباب فی العید

نے اہمیت حاصل کی ہو۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باوجود نہ عورتوں کو اس بات کی رخصت دی کہ وہ نمازِ عید میں شرکت نہ کریں اور نہ اس بات کی اجازت دی کہ وہ بغیر جلباب کے شرکت کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ میں باہر نکلنے کے لیے مذکورہ بالا پردہ اس قدر ضروری تھا کہ اسی سے ایک شریف زادی اور ایک لونڈی کے درمیان امتیاز ہوتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ خیبر کے سلسلہ میں جب صحابہؓ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ حضرت صفیہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لونڈی کی حیثیت سے رکھیں گے یا ایک منکوحہ بیوی کی حیثیت سے تو اس بارہ میں اس فیصلہ کن اصول کو سب نے تسلیم کیا کہ:

ان حجبها فهی من احدی امهات المؤمنین وان لم یحجبها فهی مما ملکت یمینه. فلما ارتحل وطّی لها خلفه ومدّ الحجاب بینها وبین الناس[1]۔	اگر ان کو پردہ کرائیں تو سمجھنا چاہیے کہ وہ امہات المومنین میں سے ایک ہیں اور اگر پردہ نہ کرائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی حیثیت لونڈی کی ہوگی، تو جب آپ نے کوچ کا ارادہ فرمایا تو اپنے پیچھے ان کے لیے بیٹھنے کا سامان کیا اور ان کے اور لوگوں کے درمیان پردہ تانا۔

پردہ کے یہ احکام ۳ھ اور ۵ھ کے درمیان نازل ہوئے ہیں، لیکن اس اہتمام کے ساتھ ان پر عمل ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حجۃ الوداع کے سلسلہ کا ایک واقعہ ازواجِ مطہرات سے متعلق بیان کرتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار پانچ سالوں کے اندر اندر یہ چیز مسلمان عورتوں کی فطرتِ ثانیہ (SECOND NATURE) بن گئی تھی۔ یہاں تک کہ جن حالات میں اس پردہ کا حکم نہیں ہے، ان حالات میں بھی وہ بالکل غیر اختیاری طور پر پردہ کا اہتمام کرنے لگی تھیں۔ چنانچہ حالتِ احرام

[1] صحیح البخاری: کتاب النکاح، باب ۱۳

میں عورت کو نقاب اور دستانے وغیرہ پہننے کی اجازت نہیں ہے لیکن روزمرہ کی عادت کا یہ اثر تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ :

كان الركبان يمرون بنا ونحن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم محرمات فاذا حاذونا سدلت احدانا جلبابها من رأسها على وجهها. فاذا جاوزونا كشفناه۔[1]	قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام باندھے ہوئے تھیں۔ جب قافلے ہمارے سامنے آتے ہم بڑی چادر سر کی طرف سے چہرے پر لٹکا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے ہم اس کو اٹھا دیتیں۔

جلباب اور گھونگٹ کی اس ہدایت کے ساتھ چند اور ہدایتیں بھی اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہیں، جن کو اس قانون کے مؤیدات میں سے سمجھنا چاہیے، اور جن کے اہتمام سے وہ مقصد بدرجۂ اتم حاصل ہوتا ہے جو شریعت نے اس قانون کے نفاذ سے مدِّنظر رکھا ہے۔ مثلاً :

جو عورت خوشبو لگائے اور اس خیال سے لوگوں کے پاس سے گزرے کہ لوگ اس کی خوشبو سے معطر مشام ہوں اس کے لیے سخت وعید ہے :

عن ابی موسیٰ، عن النبی صلى الله عليه وسلم قال، اذا استعطرت المرأة فمرت على القوم ليجدوا ريحها فهی كذا وكذا۔ قال قولا شديدا۔[2]	حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت خوشبو لگا کے لوگوں کے پاس سے اس لیے گزرے کہ وہ اس کی خوشبو سے محظوظ ہوں تو وہ عورت ایسی ایسی ہے۔ آپؐ نے نہایت سخت الفاظ میں اس کے لیے وعید سنائی۔

---

[1] سنن ابی داؤد : کتاب المناسک ، باب ۳۴

[2] سنن ابی داؤد : کتاب الترجل ، باب ما جاء فی المرأة تتطیب للخروج

عن ابی هریرة قال: لقیته امرأة وجد منها ریح الطیب ینفح، ولذیلها اعصار فقال: یا امة الجبار، جئت من المسجد؟ قالت: نعم، قال: وله تطیبت؟ قالت: نعم، قال: انی سمعت حبی ابا القاسم صلی الله علیه وسلم یقول: لا تقبل صلوٰة لامرأة تطیبت لهذا المسجد حتی ترجع فتغتسل غسلها من الجنابة۔[1]

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس سے ایک عورت گزری جس کے دامن سے خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا: خدا کی بندی! تو مسجد سے آرہی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں! پھر سوال کیا: اور اسی غرض کے لیے خوشبو لگائی تھی؟ اس نے کہا: ہاں! انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو عورت اس مسجد میں آنے کے لیے خوشبو لگائے گی اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوگی جب تک کہ وہ لوٹ کے اس طرح غسل نہ کرے جس طرح جنابت سے پاک ہونے کے لیے غسل کیا جاتا ہے۔

باہر نکلنے کی صورت میں اگر خوشبو لگائی جائے تو اس کے متعلق یہ تصریح ہے کہ اس میں رنگ ہو مگر پھوٹنے اور پھیلنے والی خوشبو نہ ہو: 'وطیب النساء لون لا ریح له'[2] (عورتوں کی خوشبو کا رنگ ظاہر ہو اور بو پوشیدہ ہو)۔

اگر باہر نکلنا سفر کی نوعیت کا ہو اور سفر کچھ لمبا ہو جس میں دو تین دن لگ جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کو بغیر کسی محرم کے نہیں نکلنا چاہیے۔[3]

---

1. سنن ابی داؤد، کتاب الترجل، باب ما جاء فی المرأة تتطیب للخروج
2. سنن ابی داؤد: کتاب اللباس، باب ۸
3. کہاں رسول خدا کا یہ حکم اور کہاں اسلامی تہذیب قائم کرنے والے مدعیوں کا اس بات پر فخر کہ اسلامی اقتصادی کانفرنس میں عورتیں نہیں آئیں، اور اسلامی ریاست کی مانند خواتین کا تنہا غیر محرم مردوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ تشریف لے جانا۔

عن ابن عمر، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یحل لامراۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر تسافر مسیرۃ ثلٰث لیال الا و معہا ذو محرم۔[1]	حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے جو ایمان رکھتی ہو اللہ پر اور یوم آخرت پر کہ وہ تین دن کا سفر کرے اور اس کے ہمراہ کوئی محرم نہ ہو۔

اس حالت میں مردوں کے لیے بھی بعض ہدایات ہیں، مثلاً:

اگر کسی سبب سے کسی عورت کا چہرہ کھلا ہوا ہو اور کسی مرد کی اس پر نظر پڑ جائے تو حکم ہے کہ پہلی نظر کے بعد فوراً اپنی نگاہ پھیرے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر فضل بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے۔ اسی اثناء میں قبیلۂ خثعم کی کوئی عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مسئلہ پوچھنے آئی۔ فضلؓ اس کو دیکھنے لگے اور وہ فضلؓ کو دیکھنے لگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا تو فضلؓ کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

گھر کے اندر کا پردہ:

اسلام نے جس طرح گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں عورتوں کو ضروری ہدایات دی ہیں، اسی طرح نہایت تفصیل کے ساتھ اس حالت کے لیے بھی ہدایات دی ہیں جب وہ گھر کے اندر ہوں۔ کسی شخص کے زنانہ مکان کے اندر کوئی غیر شخص داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر داخل ہو سکتا ہے تو کن شرائط کے تحت داخل

---

1 صحیح مسلم، کتاب الحج، باب سفر المراۃ مع محرم الی حج وغیرہ

ہو سکتا ہے؟ میاں اور بیوی کے اعزہ میں سے کوئی ایسا شخص گھر کے اندر داخل ہو جو گھر کی بیبیوں کے لیے غیر محرم کی حیثیت رکھتا ہو تو ایسی صورت میں داخل ہونے والے کے لیے اور گھر کی بیبیوں کے لیے کیا ہدایات ہیں؟ محرم عزیزوں مثلاً باپ، بھائی، بیٹے وغیرہ کے معاملہ میں عورتیں کس حد تک پردہ کی پابندیوں سے آزاد ہو سکتی ہیں؟ متعلق اور غیر متعلق عورتوں، ملازموں اور غلاموں کی گھر کے اندر آمد و شد کے لیے کیا ضابطہ ہے؟ ان سارے سوالوں کے جوابات خود قرآن میں موجود ہیں اور ایسی وضاحت کے ساتھ موجود ہیں کہ ان میں نہ کسی شک کی گنجائش ہے اور نہ کسی بحث و اختلاف کی۔ ہم یہاں ترتیب کے ساتھ پہلے قرآن سے اس سلسلہ کی ضروری ہدایات نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اس سے متعلق احادیث میں جو بعض ضروری تفصیلات آئی ہیں، ان کو بھی نقل کریں گے۔

(ل) کسی شخص کے زنانہ مکان میں، جس میں اس کے بیوی بچے رہتے ہوں کسی دوسرے شخص کو داخل ہونے کی اجازت صرف دو شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے:

(۱) ایک یہ کہ صاحب خانہ کے ساتھ اس کو استیناس حاصل ہو۔ استیناس سے مراد تعلق اور ربط و ضبط ہے۔ یہ تعلق عزیزداری کا بھی ہو سکتا ہے، محبت و دوستی کا بھی ہو سکتا ہے، ملازمت اور غلامی کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے کسی تعلق کے بغیر اسلامی معاشرہ میں کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان کے زنانہ مکان میں داخل ہونے کا ارادہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ داخل ہونے سے پہلے گھر والوں سے اجازت حاصل کرے۔ اس اجازت کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ دروازہ پر کھڑے ہو کر گھر والوں کو سلام کرے۔ اگر اس کے بعد اس کو اجازت مل جائے تو داخل ہو ورنہ اُلٹے پاؤں واپس لوٹ آئے۔ حدیث میں سلام کے لیے ایک حد بھی متعین کر دی

گئی ہے کہ اجازت کے لیے تین بار تک سلام کرے۔ اس کے بعد بھی اجازت نہ ملے تو الٹے پاؤں واپس چلا جائے۔

قرآن مجید میں یہ قانون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۖ هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ○ لَّيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ۔ (النور: ۲۴- ۲۷-۲۹)	اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تعارف نہ پیدا کر لو اور گھر والوں کو سلام نہ کر لو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے موجب خیر و برکت ہے تاکہ تمہیں یاد دہانی حاصل رہے۔ پس اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمہیں اجازت نہ ملے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی طریقہ تمہارے لیے پاکیزہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور ان غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہونے میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں جن میں تمہارے لیے کوئی منفعت ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ اسلامی سوسائٹی ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کے اندر کسی غیر متعلق شخص کو کسی شخص کے زنانہ مکان کے اندر داخل

جھنے کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ صرف کسی شخص کے اعزہ و متعلقین ہی اس کے زنانہ مکان کے اندر داخل ہونے کے مجاز ہیں اور وہ بھی اس صورت میں جب انہوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق اجازت حاصل کر لی ہو۔

(ب) یہ اعزہ و متعلقین مذکورہ بالا شرائط پورا کرنے کے بعد جب گھر کے اندر داخل ہوں گے تو اس صورت میں ان پر بھی اور گھر کی عورتوں پر بھی چند پابندیاں عائد ہوں گی، جن کا اہتمام دونوں کے لیے ضروری ہے۔

داخل ہونے والے مردوں کے لیے مندرجہ ذیل دو ہدایتیں ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ گھر کی عورتوں کو گھورنے، اُن سے آنکھیں لڑانے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ان سے باتیں کرنے کی کوشش نہ کریں۔

(۲) دوسری یہ کہ پوری تہذیب و شائستگی کا لحاظ رکھیں، کوئی ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالیں جو شرم و حیا کے منافی ہو، کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو وسوسہ انگیز اور نفس کے فاسد میلانات کو چھیڑنے والی ہو، نیز اپنے حدودِ ستر کی نگہداشت کا پورا اہتمام رکھیں۔

گھر کی بیبیوں کو مندرجہ ذیل پانچ باتوں کا اہتمام کرنا ہوگا:

(۱) ایک یہ کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، داخل ہونے والے مردوں سے آنکھیں لڑانے کی کوشش نہ کریں۔

(۲) دوسری یہ کہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

(۳) تیسری یہ کہ اس زینت کے سوا جو ناگزیر طور پر ظاہر ہو جائے — مثلاً لباس کا ظاہری حصہ یا ہاتھ اور چہرہ کا کوئی حصہ — اپنی زینت کی چیزوں یا جگہوں کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ سمٹ سمٹا کر رہیں اور اپنے آپ

کہ اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ خواہ مخواہ کو ان کی طرف توجہ نہ ہو۔

(۴) چوتھی یہ کہ سروں پر اوڑھنیاں ڈال لیں اور گریبانوں پر ان کے بُکل مار لیں۔

(۵) پانچویں یہ کہ اس دوران میں اگر کسی ضرورت سے گھر کے اندر نقل و حرکت کی نوبت آئے تو دبے پاؤں آئیں جائیں، زمین پر پاؤں مار کے نہ چلیں کہ زیوروں کی جھنکار سنائی دے[1]۔

یہ ساری باتیں قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہیں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ	مومنوں کو ہدایت کرو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی
اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ	رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی پردہ پوشی
ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۗ اِنَّ	کریں۔ یہ طریقہ ان کے لیے پاکیزہ ہے بے شک
اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○	اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ	اور مومن عورتوں کو کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ	نیچی رکھیں اور اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت
فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ	کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ
اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ	کریں مگر جو ناگزیر ہو، یہ ظاہر ہو جائے اور
بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ص ...	اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار

[1] اس مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو سورۂ احزاب میں جو ہدایات دی گئی ہیں اگر ان کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو "فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ" (الآیۃ) کے الفاظ سے ایک چھٹی ہدایت یہ بھی نکلتی ہے کہ اگر کسی مرد سے بات کرنے کی نوبت آئے تو گفتگو میں لوچ اور نزاکت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں اصل بات کر کے گفتگو ختم کر دی جائے۔ اس ہدایت کو خواہ کتنا ہی کھینچ تان کر لیا جائے بہرحال اس سے کسی طرح بھی یہ گنجائش نہیں نکالی جا سکتی کہ کوئی بیگم صاحبہ ساڑھی یا غرارے میں پبلک سٹیج پر تشریف لائیں اور مجمع عام میں تقریر فرمائیں!!

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ	کیا کریں.... اور عورتیں اپنے پاؤں زمین
لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ	پر مار کے نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت
زِيْنَتِهِنَّ ؕ	ظاہر ہو۔

(النور، ۲۴ : ۳۰-۳۱)

(ج) صرف مندرجہ ذیل اعزہ و متعلقین کے سامنے عورت زینت کا اظہار کر سکتی ہے، اور سمٹ سمٹا کر رہنے کی جو پابندی مذکورہ بالا آیت میں اس پر عائد کی گئی ہے ان کے لیے اس پابندی کے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے :

(۱) شوہر۔

(۲) باپ۔

(۳) خُسر۔

(۴) بیٹے۔

(۵) شوہر کی اولاد جو اس کی دوسری بیویوں سے ہو۔

(۶) بھائی : جن میں سگے، سوتیلے اور رضاعی، تینوں قسم کے بھائی شامل ہیں۔

(۷) بھتیجے : یعنی مذکورہ بالا تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد۔

(۸) بھانجے : یعنی مذکورہ بالا تینوں قسم کی بہنوں کی اولاد۔

(۹) اپنے میل جول کی عورتیں — غیر متعلق عورتوں کے سامنے زینت کے اظہار کی وجہ سے بسا اوقات عورتیں اخلاقی اور مالی دونوں قسم کی آفتوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں بلکہ بعض حالات میں اس کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

(۱۰) غلام۔

(۱۱) ملازم: جو بڑھاپے کی وجہ سے جنسی میلان سے خالی ہو چکا ہو۔ نوجوان ملازم کے معاملہ میں تمام پابندیاں باقی رہیں گی۔

(۱۲) بچے: جو ابھی بلوغ کے تقاضوں سے نابلد ہوں۔

مذکورہ بالا استثنا، قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا
لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ
بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ
أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ
إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ
أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ
أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ
أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ
مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ
لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ
(النور ۔ ۲۴ : ۳۱)

اور اپنی زینت[1] کا اظہار نہ ہونے دیں مگر
اپنے شوہروں کے سامنے یا اپنے باپوں
کے سامنے یا اپنے شوہروں کے باپوں
کے سامنے یا اپنے بیٹوں کے سامنے یا اپنے
شوہروں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں
کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے
یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے تعلق
کی عورتوں کے سامنے یا اپنے مملوکوں کے سامنے
یا ایسے زیرِ کفالت مردوں کے سامنے جو عورت
کی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں یا ایسے بچوں
کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پس پردہ چیزوں
سے آشنا نہ ہوں۔

(د) اوپر (ل) کے تحت اجازت لینے کی جو شرط لگائی گئی ہے، وہ گھروں میں ہر

---

[1] یعنی آرائش، بناؤ سنگھار، زیور اور خوش رنگ و خوش وضع لباس۔ زینت کا کوئی مفہوم اس کے سوا نہیں بتایا جا سکتا۔ اب ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے لیڈروں اور حکمران طبقہ کی بیگمات جس حالت میں منظرِ عام پر جلوہ فرمائی ہیں وہ 'زینت' کی تعریف میں آتی ہے یا نہیں؛ اور ہر شخص یہ بھی دیکھ سکتا ہے کہ آیا یہ قرآن مجید کے صریح حکم کی خلاف ورزی ہے یا ملاؤں کے گھڑے ہوئے احکام کی!

وقت آمد و رفت رکھنے والے غلاموں اور نابالغ بچوں اور ملازموں کے لیے ڈھیل کر دی گئی ہے۔ ان کو صرف تین اوقات میں اجازت لینے کی ضرورت ہے: نمازِ فجر سے پہلے جب کہ گھر والے اپنے بستروں میں ہوتے ہیں، ظہر کے وقت جب کہ قیلولہ کا وقت ہوتا ہے اور عشاء کے بعد جب کہ گھر والوں کے آرام کا وقت ہوتا ہے۔ یہ تینوں اوقات بے پردگی کے ہیں۔ ان وقتوں میں کسی کے اچانک داخل ہو جانے کی صورت میں اس کا امکان ہے کہ وہ گھر والوں کو ایسی حالت میں دیکھ لے جس حالت میں دیکھا جانا پسندیدہ نہ ہو، اس وجہ سے ان اوقات میں غلام اور نابالغ کے لیے بھی اجازت لینے کا حکم ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے اوقات میں عام ضرورت کا لحاظ کر کے ان کو اجازت کی پابندی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ البتہ نابالغ ملازم۔ جو غلام نہیں ہے۔ بالغ ہو جانے کے بعد اس رخصت سے محروم ہو جائے گا۔ اس کو دوسرے مردوں کی طرح تمام اوقات میں اجازت لینی پڑے گی۔ یہ استثناء قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ	اے ایمان والو! تمہارے غلام اور لونڈیاں بھی
الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ	اور تمہارے اندر کے وہ بھی جو ابھی بلوغ کو نہیں
لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ	پہنچے ہیں تینوں وقتوں میں اجازت لیا کریں:
مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ	ایک نمازِ فجر سے پہلے، دوسرے دوپہر کو جب
وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ	تم اپنے کپڑے اتارتے ہو اور نمازِ عشاء کے
الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫	بعد۔ یہ تین اوقات تمہاری بے پردگی کے
ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ	ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ تمہارے اور
وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ	ان کے اوپر بدون اجازت آنے جانے
طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ	میں کوئی قباحت نہیں۔ تم ایک دوسرے

عَلٰی بَعْضٍ۔ کے پاس آمد و شد رکھنے والے ہو۔

(النور - ۲۴ : ۵۸)

(۵) بڑی بوڑھی عورتیں جو اب نکاح کے قابل نہیں رہ گئی ہیں، ستر کے رہنے، سر پر دوپٹہ ڈالنے، سینہ پر آنچل مارنے کی ان پابندیوں سے آزاد ہیں جو (ب) کے تحت عام عورتوں کے لیے بیان کی گئی ہیں بشرطیکہ وہ اس آزادی کو اظہار زینت کے لیے استعمال نہ کریں۔ اور اگر وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح ان باتوں کا اہتمام کریں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

قرآن مجید نے یہ استثناء ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْھِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَھُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّھُنَّ ؕ	اور عورتوں میں سے بڑی بوڑھیاں جو اب نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، اگر اپنے دوپٹے اُتار دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں اور یہ بات کہ وہ بھی احتیاط کریں ان کے لیے بہتر ہے۔
(النور - ۲۴ : ۶۰)	

بعض تفصیلات حدیث میں:

یہ ساری تفصیل خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ اب ہم بعض حدیثیں پیش کرتے ہیں جو گھروں کے اندر پردہ سے متعلق ہیں اور جن سے قرآن مجید کے مذکورہ بالا احکام کی تائید یا توضیح ہوتی ہے:

ان سھل بن سعد الساعدی اخبرہ ان رجلا اطلع فی	حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت

حُجرہ فی باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مِدرًی یحک بہ رأسہ۔ فلما راٰہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لو اعلم ان تنتظرنی لطعنت بہ فی عینیکَ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انما جُعِل الاذن من قبل البصر[1]۔	صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے دروازے کے سوراخ سے آپ کے مکان کے اندر جھانک رہا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چیز تھی جس سے آپ اپنا سر کھجا رہے تھے۔ جب آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھے جھانک رہے ہو تو میں اس چیز سے تمہاری آنکھ پھوڑ دیتا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مکان کے اندر داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کی شرط تو نگاہ ہی کے سبب لگائی گئی ہے۔

امام بخاریؒ نے مذکورہ بالا روایت کی بنا پر یہ باب باندھا ہے کہ اگر ایک شخص کسی کے مکان کے اندر جھانکنے کی کوشش کرے اور صاحب خانہ کسی چیز سے اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس کے ذمے دیت (DAMAGES) عائد نہیں ہوگی۔

غلام کے متعلق اوپر یہ ہدایت گزر چکی ہے کہ اس سے پردہ نہیں ہے، لیکن غلام اگر مکاتب[2] ہو تو اس سے پردہ کرنا چاہیے۔

عن ام سلمۃ تقول: قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان کان لاحداکن مکاتب فکان عندہ ما یؤدی فلتحتجب منہ۔	حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اگر تم میں سے کسی کا مکاتب غلام ہو جس کے پاس ادا کرنے کے لیے رقم موجود

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الدیات، باب من اطلع فی بیت قوم ففقئوا عینہ فلا دیۃ لہ

[2] یعنی جس غلام سے آقا کا یہ معاہدہ ہو جائے کہ وہ اپنے فدیے کی رقم (RANSOM MONEY) ادا کر کے آزاد ہو جائے گا۔

منتہ۔ ہو تو اس سے پردہ کرنا چاہیے۔

عزیزوں اور رشتہ داروں سے جس قسم کے پردہ کا حکم سورۂ نور کی آیات میں دیا گیا ہے، احادیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

عن عبد المطلب بن ربیعۃ بن الحرث بن عبد المطلب و الفضل بن عباس، قال عبد المطلب: فانطلقت انا والفضل الی باب حجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم... وھو یومئذ عند زینب بنت جحش. فقمنا بالباب حتی اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخذ باذنی واذن الفضل ثم قال: اخرجا ما تصرران ثم دخل فاذن لی وللفضل. فدخلنا فتواکلنا الکلام قلیلاً ثم کلمتہ او کلمہ الفضل، قد شک فی ذالک عبد اللہ. قال: کلمہ بالامر الذی امرنا بہ ابوانا. فسکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھتیجے عبد المطلب بن ربیعہ بن حرث بن عبد المطلبؓ اور آپؐ کے چچازاد بھائی فضل بن عباسؓ، دونوں صاحبوں سے یا خاص عبد المطلبؓ روایت ہے کہ میں اور فضل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ کے دروازہ پر پہنچے اور آپؐ اس روز ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ[2] کے یہاں تھے۔ ہم دروازہ پر کھڑے رہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپؐ نے (پیار سے) میرے اور فضل کے کان پکڑے اور ارشاد فرمایا: کیا دبائے کر آئے ہو فرماؤ؟ پھر آپؐ گھر میں چلے گئے اور ہم دونوں کو اندر آنے کی اجازت دی۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ لیکن کچھ دیر تک ہم چپ چاپ کھڑے رہے۔ ہم میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ دوسرا بات کا آغاز

---

۱ سنن ابی داؤد، کتاب العتق، باب ۱

۲ واضح رہے کہ حضرت زینبؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی صاحبزادی تھیں، اس لیے عبد المطلب بن ربیعہؓ اور حضرت فضل بن عباسؓ، دونوں سے ان کا وہی رشتہ تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساعة ورفع بصرہ قبل سقف البیت حتی طال علینا انه لا یرجع الینا شیئا حتی رأینا زینب تلمع من وراء الحجاب بیدها تریدان لا تعجلا وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی امرنا۔[1]

گئے۔ بالآخر میں نے (یا فضل نے راوی کو شک ہے) جرأت کرکے زبان کھولی اور ہمارے باپوں نے ہم کو جس مقصد کے لیے بھیجا تھا اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ ہماری بات سن کر کچھ دیر تک آپ خاموشی کے ساتھ چھت کی طرف نگاہ کرکے غور کرتے رہے۔ جب زیادہ دیر ہوگئی تو ہم نے سمجھا کہ آپ کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ زینب پردہ کی اوٹ سے ہاتھ سے اشارہ کر رہی ہیں کہ گھبراؤ نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے معاملہ پر غور کر رہے ہیں۔

عن عائشة، ان اسماء بنت ابی بکر دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیها ثیاب رقاق، فاعرض عنها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وقال: یا اسماء ان المرأة اذا بلغت المحیض لم تصلُح ان یُری منها الا هٰذا وهٰذا واشار الی وجهه

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اسماء بنت ابی بکر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور وہ نہایت باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو منہ پھیر لیا اور فرمایا کہ اے اسماء! عورت جب بالغ ہو جائے تو بجز اس کے اور اس کے اس کے جسم کا کوئی

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارة والفئ، باب ۲۰

وکفیہ ا

اور حصہ نظر نہیں آنا چاہیے اور آپ نے چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔[2]

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیوں کے کھولنے کی اجازت کا تعلق گھر کے اندر کے پردہ سے ہے نہ کہ باہر کے پردہ سے۔

الغرض میں جس قسم کی احتیاطوں کی ہدایت گھر کے اندر کے پردہ سے متعلق سورۂ نور میں دی گئی ہے اس قسم کی احتیاطیں ملحوظ رکھ کے وہ باہر بھی ایک دوسرے کے قریب ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی ہیں، مندرجہ ذیل روایت سے ملتا ہے:

عن اسماء بنت ابی بکر قالت: خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجاجا، حتی اذا کنا بالعرج نزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و نزلنا فجلست عائشۃ الی جنب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجلست الی جنب ابی۔	حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ روایت کرتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر حج میں نکلے۔ جب عرج پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اترے اور ہم بھی اترے۔ اور ایک ہی جگہ، عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بیٹھیں اور میں اپنے باپ کے پاس بیٹھی۔[3]

1. سنن ابی داؤد: کتاب اللباس، باب فیما تبدی المرأۃ من زینتھا
2. اب ذرا ان لباسوں پر بھی غور فرمائیے جن میں سے کلائیاں اور بازو اور سینے کا بالائی حصہ تو بالکل ہی برہنہ رہتا ہے اور باقی جسم کا بھی اچھا خاصا حصہ چمکتا رہتا ہے۔ ایسے لباس پہن کر جو بیگمات بھائی بھتیجوں ہی کے سامنے نہیں مجمع عام میں تشریف لاتی ہیں، کیا وہ کسی ملا کے خودساختہ حکم کی نافرمانی کر رہی ہیں یا براہ راست رسول خدا کے حکم کی؟
3. سنن ابی داؤد: کتاب المناسک (الحج) باب المحرم یؤدب غلامہ

سورۂ نور میں 'غیر اولی الاربۃ' کو جو رخصت دی گئی ہے، اس رخصت کو استعمال کرنے میں بے احتیاطی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ متعلق شخص کی ذہنی و اخلاقی حالت کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ بعض مرد خود تو بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر ان کے فاسد میلانات بدستور جوان رہتے ہیں۔ ایسے غیر اولی الاربہ کو بھی گھروں کے اندر آنے جانے کی آزادی دے دینے سے مختلف قسم کے مفاسد پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس پرہیز کا لحاظ ضروری ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مدینہ میں ایک مخنث تھا جو ازواج مطہرات رض کے یہاں آیا جایا کرتا تھا اور وہ اس کو غیر اولی الاربہ سمجھ کر اس سے پردہ نہیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی آمد و رفت روک دی[1]۔

بعض دوسری روایات سے اس کی مزید تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ایک عورت کے سراپا کی تصویر اس طرح کھینچی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ظالم نسوانی محاسن کی بڑی گہری پرکھ بھی رکھتا ہے اور بیان میں ان کی تصویر بھی کھینچ دے سکتا ہے۔ اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنے گھروں میں آنے جانے سے روک دیا، بلکہ اس کے معاملہ میں لوگوں کی عام بد احتیاطی کو دیکھ کر اس کو مدینہ ہی سے نکال دیا۔

اگر گھر کے اندر داخل ہونے والا آنکھوں سے معذور ہو تو اس کے سبب سے غضِ بصر کی ذمہ داری اس پر سے آپ سے آپ ساقط ہو گئی ہو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اس صورت میں گھر کی عورتوں پر سے بھی غضِ بصر اور دوسری احتیاطوں

---

1. سنن ابی داؤد: کتاب اللباس، باب فی قولہ 'غیر اولی الاربۃ'

کی ذمہ داری ساقط ہو گئی:

عن ام سلمة، قالت: كنت عند رسول الله صلى الله عليه وسلم وعنده ميمونة فاقبل ابن ام مكتوم، وذلك بعد ان امرنا بالحجاب، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: احتجبا منه فقلنا: يا رسول الله! اليس اعمى لا يبصرنا ولا يعرفنا؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم: افعمياوان انتما الستما تبصرانه؟[2]

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی اور وہیں میمونہؓ بھی موجود تھیں کہ ابن ام مکتومؓ آئے اور یہ بات اس وقت کی ہے جب حجاب کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ان سے حجاب کرو۔[1] ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا یہ نابینا نہیں ہیں، نہ ہمیں دیکھتے ہیں اور نہ پہچانتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: کیا تم بھی اندھی ہو اور تم بھی ان کو نہیں دیکھتی ہو؟

جس طرح باہر نکلنے کے لیے جلباب کا اہتمام ضروری ہے، اسی طرح گھر کے اندر دوپٹہ کا اہتمام ضروری ہے تاکہ عندالضرورت اس سے سر چھپایا جا سکے اور سینہ پر بکل مارا جا سکے:

عن عائشة، انها ذكرت نساء الانصار فاثنت عليهن، وقالت لهن معروفا، وقالت: لما نزلت سورة النور عمدن الى حجوز

حضرت عائشہؓ نے انصار کی عورتوں کی تعریف فرمائی کہ جب سورۂ نور نازل ہوئی اور اس میں اوڑھنیاں لینے کا حکم نازل ہوا تو انہوں نے اپنے کمربند لیے اور ان کو پھاڑ کے

---

1 یہاں حجاب کرو سے مراد پردہ کی دوسری قسم یعنی گھر کے اندر والا پردہ مراد ہے۔

2 سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قوله عزوجل: وقل للمؤمنات یغضضن من ابصارهن۔

فشققنهن فاتخذ نه خمرا[1]

ان کے دوپٹے بنا لیے۔

حضرت عائشہؓ سے دوسری روایت ہے:

عن عائشة انها قالت: يرحم الله نساء المهاجرات الاول، لما انزل الله: وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ شققن اكنف[2]

انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مہاجرین اوّلین کی عورتوں پر رحم کرے جب یہ حکم نازل ہوا کہ دوپٹے گریبانوں پر ڈال لیا کریں تو انھوں نے اپنی موٹی قسم کی چادریں پھاڑ کر ان سے دوپٹے بنا لیے۔

دوپٹے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دبیز ہو تاکہ جسم کی غمازی نہ کرے:

عن دحية بن خليفة الكلبي انه قال: اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بقباطي، فاعطاني منها قبطية، فقال: اصدعها صدعين فاقطع احدهما قميصا واعط الآخر امرأتك تختمر به. فلما ادبر قال: وأمر امرأتك ان تجعل تحته ثوبا لا يصفها[3]

حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قباطی (مصری کپڑے) آئے تو اس میں سے آپؐ نے ایک مجھے بھی عنایت فرمایا اور فرمایا کہ اس کے دو حصے کر کے ایک حصہ کی قمیص بنوا لو اور دوسرا اپنی بیوی کو دے دو کہ اس کا دوپٹہ بنوا لیں، جب وہ چلے تو ارشاد ہوا کہ اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لیں کہ جسم کی غمازی نہ کرے۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قولہ تعالیٰ یدنین علیھن من جلابیبھن

[2] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قولہ ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن

[3] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس القباطی للنساء۔

اگر اتفاق سے کسی عورت سے آمنا سامنا ہو جائے اور نگاہ اس کے چہرے پر پڑ جائے تو آدمی فوراً نگاہ پھیرے:

عن جریر، قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نظرة الفجاءة فقال: اصرف بصرك[1] ۔	حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتفاق سے کسی عورت پر نگاہ پڑ جانے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: تو فوراً اپنی نگاہ پھیرے!

نگاہ اور زبان کو کسی فتنہ میں پڑنے سے بچانا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فزنا العينين النظر، فزنا اللسان المنطق، والنفس تمنى وتشتهي، والفرج يصدق ذلك ويكذبه[2] ۔	آنکھوں کا زنا غیر عورت کو گھورنا اور زبان کا زنا اس سے لگاوٹ کی باتیں کرنا ہے۔ نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔[3]

بعض مستثنیات:

گھر کے باہر اور گھر کے اندر کے پردہ سے متعلق یہ کلیات ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن و حدیث میں جس تفصیل کے ساتھ پردہ کے متعلق ہدایات دی

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب ما یؤمر بہ من غض البصر
[2] سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب ما یؤمر بہ من غض البصر
[3] اب ذرا یہ بھی ملاحظہ ہو کہ اولمپک کی کھیلوں میں، زنانہ فیشن شو کی پریڈوں میں، نمائشوں، سینما بازاروں میں اور جلسوں اور کانفرنسوں میں ہزاروں لاکھوں آدمی خوب نظر جما کر بیگمات کو دیکھتے ہیں اور ہمارے اخبارات میں شیریں بیان نامہ نگار ان کے جسم و لباس اور ان کے کرتبوں کی تعریفیں چھاپتے ہیں اور ان حرکتوں پر جو اعتراض کرتا ہے اس کو [illegible] کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

گئی ہیں۔ اس تفصیل کے ساتھ نکاح و طلاق کے سوا شاید ہی کسی معاشرتی مسئلہ سے متعلق احکام و ہدایات موجود ہوں۔ پھر جس طرح ہر کلیہ کے تحت بعض مستثنیات ہوتے ہیں، اسی طرح ان کلیات کے تحت بھی حکمت و مصلحت اور اضطرار کے تحت بعض مستثنیات ہیں، مثلاً:

(۱) حالتِ احرام میں عورت کو نقاب اور دستانے وغیرہ پہننے کی ممانعت ہے تاکہ تبتّل اِلیٰ اللہ کی جو شان ایک مردِ محرم سے ظاہر ہوتی ہے، وہ شان عورتوں کی وضع و ہیئت سے بھی ظاہر ہو۔

(۲) اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو اس کو معاشرتی مصلحت کے تحت اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ چوری چھپے عورت کو دیکھ سکتا ہے:[۱]

عن جابر بن عبد اللہ، قال:	حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
وسلم: اذا خطب احدکم	اگر تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کے لیے
المرأة فان استطاع ان ینظر	منگنی کرے تو اگر وہ اس کو اس حد تک
الی مایدعوہ الی نکاحہا	دیکھ سکے جو اس کو اس کے ساتھ شادی
فلیفعل. قال: فخطبت جاریة	کرنے پر مائل کر سکے تو وہ یہ کرے۔ وہ کہتے
فکنت اتخبأ لہا، حتی رأیت	ہیں کہ میں نے ایک لڑکی کے لیے منگنی کی تو
منہا مادعانی الی	میں اس کو دیکھنے کے لیے چھپتا رہا، یہاں
نکاحہا و تزوجہا)	تک کہ میں نے اس کو اس حد تک دیکھ لیا

[۱] لیکن واضح رہے کہ چوری چھپے بس ایک نگاہ دیکھ لینے کی اجازت ہے۔ گرل فرینڈ شپ کی گنجائش اسلامی معاشرت میں نہیں ہے۔

فنزوجتھا۔ جس کے بعد میری طبیعت اس کے ساتھ نکاح کرنے کی طرف مائل ہوگئی اور میں نے اس سے شادی کر لی۔

انہی مستثنیات کو سامنے رکھ کر فقہاء نے ضرورت اور اضطرار کی صورتوں کے لیے احکام مستنبط کر لیے ہیں۔ مثلاً جج اگر کسی عورت کو شناخت کرنا چاہتا ہے تو اس مقصد کے لیے اس کو دیکھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر کسی مریض عورت کے علاج یا آپریشن کے سلسلے میں اس کو دیکھ سکتا ہے یا اس کے جسم کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔ بعض ناگہانی حالات میں ایک مسلمان اپنے ایک دوسرے مسلمان بھائی کے گھر میں گھس سکتا ہے۔ بعض اضطرار کے حالات میں ایک غیر مرد ایک غیر عورت کو چھو سکتا ہے۔ مثلاً ایک عورت پانی میں ڈوب رہی ہے یا آگ میں جل رہی ہو وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب مستثنیات ہیں جو قواعد کلیہ کے تحت ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ یہ مستثنیات ہی قواعد کلیہ بن جائیں اور خود قواعد کلیہ ہوا ہو کے رہ جائیں۔ جس طرح اضطرار کے تحت جان بچا لینے کے لیے آدمی خنزیر کا گوشت کھا سکتا ہے یا بقدر سدِ رمق شراب پی لے سکتا ہے، اسی طرح کسی اضطراری اور ناگہانی حالت میں پردہ کے مقررہ قواعد کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جس طرح اضطرار میں خنزیر اور شراب کی اجازت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی انہی کو غذا بنا بیٹھے، اسی طرح بعض حالات میں پردہ کے معاملہ میں جو رخصت دی گئی ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ بے پردگی ہی اسلام کا قانون ہے۔

---

1 سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی الرجل ینظر الی المرأۃ وھو یرید تزویجھا

بعض شبہات کا ازالہ :

بعض حدیثیں ایسی ہیں جن کی اصلی نوعیت عام لوگوں پر واضح نہیں ہے اس وجہ سے لوگ ان سے غلط استدلال کرتے ہیں. مثلاً بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّ حرامؓ اور اُمّ سلیمؓ کے یہاں اکثر تشریف لے جاتے تھے اور کبھی کبھی آپ ان کے یہاں قیلولہ بھی فرماتے تھے اور یہ دونوں صحابیات، جو حقیقی بہنیں تھیں، آپؐ سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو اس کی وجہ جیسا کہ بعض شارحینِ حدیث نے بتائی ہے، یہ ہے کہ باپ کی طرف سے یا ماں کی طرف سے آپ ان کے ساتھ رضاعت کا رشتہ رکھتے تھے اور ان کے ہاں زیادہ آمدورفت کا سبب یہ تھا کہ اُن کے نہایت قریبی اعزہ اسلام کی راہ میں شہید ہوئے تھے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر ان کو ہمدردی کا مستحق خیال فرماتے تھے.

اسی طرح حضرت ربیع بنت مُعوّذ بن عفراءؓ سے جو روایت ہے کہ جس روز میری رخصتی ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے بستر پہ بیٹھے تو ان کے یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے اور ان کی رخصتی کے موقع پہ ان کے بستر پر بیٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے باپ اور چچا دونوں بدر کے معرکہ میں شہید ہو چکے تھے اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جو اس موقع پر باپ اور چچا کی حیثیت سے ان کے سر پر دستِ شفقت رکھ سکتے تھے۔ نیز یہ واقعہ نزولِ حجاب سے پہلے کا ہے۔

غزوات میں عورتوں کی شرکت کی نوعیت ہم آگے چل کر واضح کریں گے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس سلسلہ کی بھی بیشتر روایات نزولِ حجاب سے پہلے کی ہیں۔ مثلاً :

حضرت انسؓ کی مشہور روایت جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عائشہ بنت ابوبکرؓ اور اُمِّ سلیمؓ کو دیکھا کہ وہ پائنچے چڑھائے اور پیٹھوں پر مشکیں لادے لوگوں کو پانی پلا رہی ہیں تو یہ روایت غزوۂ احد سے متعلق ہے جب کہ پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

اگرچہ بعض عورتوں کا اپنے شوہروں یا محرم عزیزوں کے ساتھ غزوات میں نکلنا نزولِ حجاب کے بعد بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زخمیوں کے مرہم پٹی کے سلسلہ میں خدمتیں بھی انجام دی ہیں اور اگر کوئی ناگہانی موقع پیش آگیا ہے تو بعض خواتین نے بے مثال بہادری کا بھی ثبوت دیا ہے، لیکن ان واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی بے پردگی کی دلیل کی حیثیت سے نہیں پیش کیا جا سکتا۔ ان سے زیادہ سے زیادہ جس بات کا ثبوت ملتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جس طرح حج میں عورت پردہ کی بعض پابندیوں سے آزاد ہے، اسی طرح اگر کسی موقع پر اس کو کوئی جنگی خدمت انجام دینی پڑ جائے تو پردہ کی بعض پابندیوں سے اس کو رخصت حاصل ہو جائے گی۔

مخالفینِ پردہ سے گزارش:

جو حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور اس کے باوجود اپنے قول و عمل دونوں سے پردہ کی مخالفت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ محض مولویوں کی ایجاد ہے، وہ اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمائیں کہ کسی چیز کے متعلق وہ کس طرح باور کریں گے کہ وہ اسلام کی ہے؟ پردہ کا یہ پورا ضابطہ پوری تفصیل و وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل سے اس کی پوری پوری تائید ہو رہی ہے۔

ان دونوں چیزوں کے بعد اب اور کون سی چیز پیش کی جائے جس کے بعد آپ اس کا اسلامی ہونا تسلیم کریں گے؟ اگر اسلام قرآن کی آیات اور رسول کے قول و فعل کا نام نہیں ہے تو کیا تم نے صرف اپنے نفس امارہ کی خواہشات کا نام اسلام رکھا ہے؟ نیز یہ ارشاد ہو کہ جو قوم اپنے دین کے اتنے واضح ضابطہ کی اتباعِ دین کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود اس جسارت کے ساتھ توہین کرے گی جس جسارت کے ساتھ ہمارے ارباب اقتدار نے شاہ ایران کے ورودِ کراچی کے موقع پر ہماری بہنوں کی نمائش کر کے اس کی توہین کی ہے وہ اپنے آپ کو خدا کے غضب سے کتنے دنوں تک محفوظ رکھ سکے گی!

باب ۴

پیشِ نظر اخلاقی انقلاب

آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن، زنانہ نیشنل گارڈز[1] اور اس قبیل کے دوسرے اداروں کے ذریعہ سے عورتوں کے اخلاقی تصورات میں جس قسم کا انقلاب برپا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور اسلام کے نام پر ہو رہی ہے، ہم کو اسلامی نقطۂ نظر سے مختصراً اس پر بھی تبصرہ کرنا ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم نے جو معلومات فراہم کر دی ہیں ان پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ نسوانی اخلاق کی تمام معروف اسلامی قدروں کو نگاہوں سے گرانے اور ان کی بجائے دوسری قدروں کو دلوں میں جگہ دلانے کی جدوجہد پورے زوروں سے اوپر سے لے کر نیچے تک جاری ہے۔ اب تک جو صفتیں ایک مسلمان عورت کے لیے قابلِ تعریف سمجھی جاتی رہی ہیں اور جو "شریف عورت" بطور ایک اخلاقی نصب العین کے، جن کو نگاہ میں رکھی گئی، اب ان کو ایک ایک کر کے قابلِ نفرت ٹھہرایا جا رہا ہے تاکہ ہر عورت ان سے گھِن کرے اور اگر ان کا کوئی شائبہ اس کے اندر پایا جاتا ہو تو جب تک وہ ان سے

---

[1] گرل گائیڈز کا ایک مظاہرہ فروری کے مہینہ میں لاہور میں ہوا تھا جس میں "ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور کے بیان کے مطابق آٹھ سو لڑکیوں نے حصہ لیا۔ اس تنظیم کا مقصود چھوٹی عمر سے لڑکیوں کے اندر ان اوصاف کو تربیت دینا ہے جو آگے چل کر ان کو "قیادتِ ملت" کی ان خدمات کے لائق بنا سکیں جن میں آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی کارکن خواتین رات دن سرگرمِ کار ہیں۔ بیگم جی اے خان اس کی چیف کمشنر ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق پانچ ہزار لڑکیاں پنجاب کے اندر اس تنظیم میں اس وقت تک شامل ہو چکی ہیں۔ اس کے مظاہرے کے موقع پر بیگم فضل الرحمان صاحب نے جو ایڈریس دیا اس میں انہوں نے یہ فتویٰ ارشاد فرمایا کہ "گرل گائیڈز کے سارے اصول اسلام کے بنائے ہوئے ہیں!" (ملاحظہ ہو ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور مورخہ ۲۔ فروری ۱۹۵۰ء)۔ ظاہر ہے کہ اب اس امت میں ان بیگمات سے بڑھ کر دین و شریعت کو عالم کون ہے۔ یہی تو اب مسلمانوں کو یہ بتانے کی اہل رہ گئی ہیں کہ اسلام کیا سکھاتا ہے اور کیا نہیں سکھاتا!

اپنے آپ کو پاک نہ کر سکے ان کو عیب کی طرح چھپائے اور جونہی ان کو دُور کرنے کا موقع پائے فوراً ان کو نکال پھینکے۔

اب تک ہر مسلمان عورت اپنے لیے معیار اور مثال ' مائی عائشہؓ ' اور ' بی بی فاطمہؓ ' کو سمجھتی تھی لیکن اب اس کو بتایا جا رہا ہے کہ ماضی میں تیرے لیے معیار و مثال فلاں اور فلاں ہیں جو یوں گاتی تھیں اور یوں بے پردہ پھرتی تھیں اور حاضر میں تیرے لیے اُسوہ اور نمونہ فلاں لیڈر کی بیوی اور فلاں لیڈر کی بہن یا بیٹی ہیں۔

اب تک ہر عورت، خواہ اس کا اخلاقی معیار کچھ ہی ہو، یہ سمجھتی تھی کہ ناچنا اور گانا بیسواؤں اور رنڈیوں کا شیوہ ہے۔ لیکن اب بڑے بڑے جغادری مرشد اس کو یہ سکھاتے ہیں کہ تُو ناچ اور گا، کیونکہ یہ فنِ شریف تو اسلام کے دورِ اوّل میں پرورش پایا ہے اور حضرت حسینؓ کی صاحبزادی اور خلیفۂ اوّل کی نواسی نے یہ کارِ سعید انجام دیے ہیں اور مغلوں کے دور میں تو ناچنا گانا ہر لڑکی کی تربیت کا ایک جزوِ لاینفک رہا ہے۔

اب تک ہر لڑکی یہ سمجھتی تھی کہ اس کا اصل میدانِ عمل گھر ہے اس وجہ سے اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے اندر وہ سگھڑ پن اور سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کرے جو اس کو اس کی گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کے لائق بنائے اور وہ علم و ہنر سیکھے جو ایک سلیقہ شعار بیوی اور ایک لائق ماں کے فرائض انجام دینے میں اس کے کام آسکے لیکن اب اسے تربیت اس بات کے لیے دی جا رہی ہے کہ وہ باہر سے آنے والے معزز مہمانوں اور اندر سے جمع ہو جانے والے لاکھوں شائقین کے سامنے کس طرح پریڈ کرے، کس طرح سلامیاں دے، کس طرح اپنے جسمانی کرتبوں کی نمائش کرے اور کس طرح اپنی بے باکیوں پر لاکھوں مشتاقوں سے تحسین و آفرین کے نعرے لگوائے اور تالیاں پٹوائے۔

اب تک ہر لڑکی سینے پرونے، پڑھنے لکھنے، پکانے رینُدھنے، بھائیوں اور بہنوں

کو سنبھالنے اور ماں باپ کی خدمت کرنے کو اپنے لیے ہنر خیال کرتی تھی اور انہی چیزوں کی تربیت حاصل کرتی تھی۔ لیکن اب اسے بیگم آذوری کی آرٹ اکیڈمی کا رستہ دکھایا جا رہا ہے کہ تیری اصل تربیت گاہ وہاں ہے۔ تو اس اکیڈمی میں جا کے سیکھ کر جسم کس طرح بنائے جاتے ہیں، ادائیں کس طرح سانچے میں ڈھلتی ہیں، حرکتوں میں لوچ اور تحرک کس طرح پیدا کی جاتی ہے، غمزوں میں جان کس طرح آتی ہے، چال میں نزاکت اور بات میں دلکشی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔

اب تک ہر شریف باپ کی ہر شریف بیٹی اپنے لیے اس بات کو کمال شرافت سمجھتی تھی کہ جب تک باپ کے گھر میں رہے باپ بھائی کی کمائی پر، فراخی یا تنگی کی جیسی زندگی بھی میسر آئے صبر و شکر کے ساتھ گزارے اور جب شوہر کے گھر میں جائے تو اس کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کو اپنے لیے سرمایۂ فخر سمجھے اور قناعت و فرض شناسی کے ساتھ اپنی قابلیتیں ان خدمات کے ادا کرنے میں صرف کرے جو گھر اور خاندان سے متعلق ہیں۔ لیکن اب اس کو بتایا جا رہا ہے کہ لعنت ہے اس زندگی پر جو باپ کے بخشے ہوئے ٹکڑوں اور شوہر کے دسترخوان کے ریزوں پر بسر ہوئی۔ تو خود گھر سے نکل، جدوجہد کر، شکار مار، خود بھی کھا اور دوسروں کو بھی کھلا۔

اب تک رشتۂ نکاح کی گرہ خدا کی لگائی ہوئی گرہ سمجھی جاتی تھی اور اب بھی خدا کے فضل سے ہماری سوسائٹی میں ایسی بہنوں کی کمی نہیں ہوئی ہے جو اس کی حرمت پر یقین رکھتی ہیں اور اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں کہ جن کو خدا نے جوڑا ہے، ان کو موت کے سوا کوئی دوسرا بھی الگ کر سکتا ہے۔ لیکن اب عورت کو یہ سکھایا جا رہا ہے کہ ازدواج اور مناکحت کی پابندیاں تو ہماری اپنی عائد کردہ پابندیاں ہیں، کل تک ہم نے ان پابندیوں کو نافع پایا اس لیے ان کو باقی رکھا، اب اگر یہ ہماری راحتوں میں مخل ہوں تو ان کو بدل بھی سکتے ہیں۔

اب تک عفت و عصمت کو ہر بہن اور بیٹی اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتی رہی ہے اور اس کی حفاظت میں زندگی کو قربان کر دینا ہماری اخلاقی روایات کی سب سے زیادہ پر فخر داستان سمجھی جاتی تھی، لیکن اب ہمارے نئے مصلحین یہ درس دے رہے ہیں کہ عصمت فروشی کوئی بری چیز نہیں ہے، بری چیز اگر کوئی ہے تو عصمت فروشی میں ایسی بے حیائی ہے جو بدنامی کی موجب ہو۔

اب تک عورت کے لیے یہ کمال سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مرد کی ہو کے رہے اور اس کی اطاعت و وفاداری، اس کے گھر کی دیکھ بھال، اس کے بچوں کی تربیت و نگہداشت میں اپنی پوری زندگی بسر کر دے۔ لیکن اب اس کے کانوں میں یہ افسوں پھونکا جا رہا ہے کہ صرف ایک شوہر کو تلاش کر لینا اور اس کی اطاعت و وفاداری میں زندگی بسر کر دینا کوئی کمال نہیں ہے، کمال یہ ہے کہ عورت 'تعمیر ملت' کے وسیع کاموں میں اور 'خدمت وطن' کے وسیع میدانوں میں اپنی جولانیاں دکھائے۔

اب تک عورت کی ترقی یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنے نسوانی اوصاف و فضائل میں ترقی کرے۔ لیکن اب اس کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ اس کی اصلی ترقی مردوں کی ریس کرنے اور ہر پہلو سے ان کی نقل اڑانے اور زنانہ کام چھوڑ کر مردانہ کام کرنے میں ہے، اور اس کے بعد ایک ترقی یافتہ عورت کے لیے اگر کوئی زنانہ کام موزوں ہے تو بس یہ کہ وہ ناچ گانا سیکھ کر اور جسم بنانے کے فن سے واقف ہو کر مخلوط سوسائٹی میں مردوں کی تفریح طبع کا سامان فراہم کرے۔

اقدار اور نقطہ ہائے نظر کا یہ فرق کوئی معمولی اور سطحی فرق نہیں ہے، بلکہ اصولی اور بنیادی فرق ہے۔ یہ صرف ماضی اور حال کے تقاضوں اور مطالبات کی محض ایک ظاہری آویزش نہیں ہے جو کسر و انکسار کے بعد خود بخود دور ہو جائے، بلکہ یہ دو بالکل متصادم اخلاقی نظریوں کی ٹکر ہے جن میں سے ایک کی فتح دوسرے کی شکست کے بغیر ممکن نہیں

ہے۔ اور اس فتح و شکست سے پہلے لازمی ہے کہ اس پوری قوم کے اندر ایک شدید ذہنی خلفشار برپا ہو جو بالآخر ایک سخت جل چل پر منتہی ہو۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو اس قوم سے محبت ہے وہ اس صورت حال کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ یہ جس نئے سانچہ میں ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو ڈھالنے کی کوشش کی جارہی ہے یہ اسلامی سانچہ ہے یا کوئی اور سانچہ ہے۔ ہمارے نئے معلمین، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اپنے اس سانچہ کو اسلامی سانچہ کہتے ہیں۔ مسٹر لیاقت علی خان سے لے کر بیگم آذوری تک ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ ان کی زندگیوں کا کوئی قول و فعل اور ان کی کوئی نقل و حرکت اسلام کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ ان کا جینا اور مرنا سب اسلام کے لیے اور اسلام کے طریقہ پر ہے اور اسلام ہی کو از سر نو تازہ اور سربلند کرنے اور دنیا کے سامنے ایک نمونہ کا اسلامی معاشرہ پیش کرنے کے لیے وہ یہ سارے پاپڑ بیل رہے ہیں۔ بیگم آذوری اگر خٹک ناچ ناچتی ہیں تو خدانخواستہ اس لیے نہیں کہ یہ ناچ ہے، بلکہ اس لیے ناچتی ہیں کہ یہ اسلام اور تہذیب اسلام کا احیاء ہے۔ ہمارے وزیر مال اگر بیگم آذوری کے ناچ کی سرپرستی فرماتے ہیں تو یہ رقص و سرود کی سرپرستی نہیں ہے، بلکہ یہ دراصل اسلامی آرٹ کی سرپرستی ہے۔ بیگم لیاقت علی خان کراچی سے پشاور تک اور مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان تک جو کچھ بناتی پھرتی ہیں وہ بھی ہر تا سر اسلام اور خدمت اسلام ہے۔ شاہِ ایران کے ورود کے موقع پر انھوں نے پاکستان کے ناموس کی ایک بہت بڑی مقدار جو معزز مہمان کی خدمت میں پیش کر دی تو یہ بھی انھوں نے اسلام ہی کا کام کیا ہے، اسلام سے سرِمُو انحراف نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان نئے اخلاقی اصولوں کو پرکھا جائے کہ فی الحقیقت اسلام عورتوں کو یہی تعلیم دیتا ہے، جو یہ حضرات دے رہے ہیں یا اپنی ہوائے نفس پوری قوم پر مسلط کر دینے کے لیے یہ لوگ اسلام کے نام کو محض ایک آڑ کے طور

پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ آئیے دیکھیے کہ قرآن و حدیث میں عورتوں کو کیسا اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں۔

لیڈر عورتوں کے لیے قرآن کی ہدایات:

سب سے پہلے ان اخلاقی ہدایات کو لیجیے جو قرآن نے اُن عورتوں کو دی تھیں جو اُمت کی تمام عورتوں کی لیڈر بنائی گئی تھیں اور جن کو مسلمان خواتین کی تعلیم اور ان کی رہنمائی کی خدمت سپرد کی گئی تھی اور پھر اپنی لیڈر خواتین کا ان خواتین سے اور قرآن کی اخلاقی تعلیمات کا موجودہ معلمین کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں سے موازنہ کرکے دیکھیے کہ ان دونوں میں دُور پرے کی کوئی نسبت بھی ہے؟ قرآن مجید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو مخاطب کرکے یہ ہدایت دیتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ
اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ
اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَ
اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ
لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝
يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ
بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا
الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّقْنُتْ

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا
کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو
تو آؤ میں تمہیں دے دلا کر خوبصورتی کے
ساتھ رخصت کردوں اور اگر اللہ اور اس
کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو
اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم میں سے خوبی کے
ساتھ نباہ کرنے والیوں کے لیے ایک اجرِ عظیم
تیار کر رکھا ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم میں
سے جو کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوگی تو
اس کے لیے دوچند عذاب ہے۔ اور یہ بات
اللہ کے لیے آسان ہے۔ اور جو تم میں سے

مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۲۸-۳۴)	اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار بنی رہیں گی اور عمل صالح کریں گی ہم ان کو دُہرا اجر دیں گے اور ہم نے ان کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔ اے نبی کی بیوی! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور بات معروف کے مطابق کہو اور اپنے گھروں میں ٹک کے رہو اور سابقہ جاہلیت کے سے انداز اختیار نہ کرو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے اے اہل بیت نبی! کہ تم سے آلودگی کو دور کرے اور تمہیں اچھی طرح پاک کرے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو ۔۔ تمام اُمّت کی مائیں اور تمام ماؤں بہنوں کی لیڈر ہونے کی حیثیت سے ۔۔ مندرجہ ذیل ہدایات دی گئی ہیں:

(۱) ان کا مطمحِ نظر دنیا اور دنیا کا سرو سامان نہیں ہونا چاہیے، بلکہ خدا اور

رسولؐ کی اطاعت اور ان کی رضا طلبی اور آخرت کی فلاح ہونی چاہیے۔

(ب) ان کے مرتبہ اور ان کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے ان کا اخلاقی پایہ بہت بلند ہونا چاہیے۔ خدا کے یہاں ان کی برائیوں پر سزا بھی دُہری ہے اور ان کی بھلائیوں پر جزا بھی دُہری، کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کی اور تمام خواتین کی رہنما ہیں۔ اُن کا بگاڑ پوری امت کا بگاڑ اور ان کا سنوار پوری امت کا سنوار ہے۔

(ج) ان کو لہجے میں لوچ اور گفتگو میں لگاوٹ کا انداز نہیں پیدا کرنا چاہیے بلکہ وقار، سنجیدگی اور سادگی کے ساتھ بات کرنی چاہیے تاکہ سننے والے کے نفس میں کوئی غلط قسم کی خواہش نہ پیدا ہو۔

(د) ان کو بناؤ سنگھار کر کے اپنی نمائش کرتے نہیں پھرنا چاہیے بلکہ اپنے گھروں کے اندر نماز، انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں اپنے کو مصروف رکھنا چاہیے۔

(ہ) اللہ کی آیتوں اور رسولؐ کی نصیحتوں کی تبلیغ اُن کا اصلی کام ہونا چاہیے اور خدا کے جو بندے اور بندیاں ان چیزوں کی طالب ہوں اُن کو اِن سے بہرہ مند کرنا چاہیے۔

اس امت میں عورتوں کی قیادت پر جس گروپ کو اوّل اوّل سرفراز کیا گیا اس کو خدا اور رسولؐ کی طرف سے اصلاح اور تربیت اور تزکیہ کا یہ پروگرام دیا گیا تھا۔ اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ذرا ایک نظر ان متبرجات پر بھی ڈالیے جو آج لیڈر بنی ہوئی ہماری بہنوں اور بیٹیوں کی رہنمائی کرتی پھر رہی ہیں اور انصاف سے فرمائیے کہ ہے کوئی مناسبت دونوں میں؟ ان اخلاقی ہدایات کا کوئی پرچھاواں بھی اُن کی زندگیوں کے کسی پہلو پر نظر آتا ہے؟ پھر کیا ستم ہے کہ جن شیطانی عادات و خصائل کو قرآن جاہلیتِ اُولیٰ کے لفظ سے پکارتا ہے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اُن میں

آلودہ کرنے کی کوشش کی جائے اور پھر دعویٰ کیا جائے کہ یہ ان کو صبغۃ اللہ میں رنگا جا رہا ہے۔ ان حضرات کی اسلامی خدمات میں کوئی کمی رہ گئی ہے کہ یہ اس پر دین کو دانستہ مسخ کرنے اور خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں جسارت و بے باکی کا مزید اضافہ کرنا چاہتے ہیں؟

عام عورتوں کے لیے اخلاقی نصب العین:

یہ لیڈر عورتوں کے لیے ہدایات تھیں۔ اب آئیے، ملاحظہ فرمائیے کہ عام مسلمان عورتوں کے سامنے قرآن نے کیا اخلاقی نصب العین رکھا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ	اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے
وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ	والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان
وَالْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ	لانے والی عورتیں، فرمانبرداری کرنے والے
وَ الصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں، راستباز
وَالصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ	مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے
وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ	والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں،
وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ	فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار
وَالصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ	کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور
وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ	خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے
وَالْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ	مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی
كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ	شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور
لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا	اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں
عَظِيْمًا ہ وَ مَا كَانَ	اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور

لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

(الاحزاب - ۳۳ : ۳۵ - ۳۶)

اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں — ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ کسی مومن یا مومنہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۗ

(النساء - ۴ : ۳۴)

پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی، رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے۔

سورۂ تحریم میں ارشاد ہے:

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ

(التحریم - ۶۶ : ۵)

اطاعت شعار، مومنہ، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، ریاضت کرنے والیاں۔

سورۂ نور میں، اسلامی سوسائٹی اور منافقین و فساق کی سوسائٹی کا مقابلہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہوں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے

وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ	اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہوں
لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ	گی اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ یہ لوگ
مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۖ	بری ہوں گے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔

(النور ۲۴ : ۲۶)

اسی سورۂ نور میں ایک جگہ مندرجہ ذیل صفتیں بھی مذکور ہیں :

اَلْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ	پاک دامن ، بھولی بھالی ،
الْمُؤْمِنٰتِ ۔	باایمان عورتیں ۔

(النور ۲۴ : ۲۳)

مندرجہ ذیل ہدایات بھی ملاحظہ ہوں :

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ	اور مومن عورتوں کو کہو کہ وہ بھی اپنی
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ	نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے اندیشہ کی جگہوں
فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ	کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ	کا اظہار نہ کریں مگر جو ناگزیر طور پر ظاہر
مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ	ہو جائے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں
عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ	کے آنچل مار لیا کریں اور اپنی زینت کا اظہار
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ	نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے سامنے یا اپنے باپوں کے
اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ	سامنے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے سامنے یا اپنے
اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ	بیٹوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں
اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ	کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے سامنے یا اپنے
اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ	بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنی بہنوں
اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ	کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے تعلق کی عورتوں

أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ	کے سامنے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا ایسے
أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا	زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کی غرض
عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ	کی عمر سے نکل چکے ہوں یا ایسے بچوں کے سامنے
بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ	جو ابھی عورتوں کی پس پردہ چیزوں سے آشنا
مِن زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوا إِلَى	نہ ہوں۔ اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار
اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ	کے نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو۔ اور
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○	اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کی طرف
(النور، ۲۴ : ۳۱)	رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے بیعت لیتے وقت جن اخلاقی پابندیوں کا عہد لیتے تھے، وہ ملاحظہ ہوں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ	اے پیغمبر! جب تمہارے پاس مومن عورتیں
الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ	اس بات پر بیعت کے لیے آئیں کہ وہ کسی
أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا	چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں گی اور نہ
وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ	چوری کریں گی اور نہ بدکاری کی مرتکب
وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا	ہوں گی اور نہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی[1]
يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ	اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے
بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ	منسوب کر کے کوئی بہتان تراشیں گی اور نہ کسی
وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ	امر معروف میں تمہاری نافرمانی کریں
فَبَايِعْهُنَّ ۔	گی تو ان سے بیعت لے لو۔
(الممتحنہ ۶۰ : ۱۲)	

---

[1] واضح رہے کہ ضبط تولید اور اولاد کی اسقاط کی تمام مروجہ تدبیریں بھی قتل اولاد کے تحت آتی ہیں۔

قرآن نے عورتوں کے سامنے دو مثالی کیریکٹر رکھے ہیں اور ہر مومنہ کو ان نمونوں کی پیروی کی دعوت ہے۔

ایک نمونہ فرعون کی بیوی کا ہے جو خدا اور اس کے دین کے ایک بہت بڑے دشمن بادشاہ کی ملکہ تھیں، لیکن اتنے بڑے شخص کی بیوی ہونے اور اتنے برے ماحول کے اندر رہنے کے باوجود وہ صدقِ دل سے خدا سے ڈرنے والی اور اس کے حکموں پر چلنے والی تھیں۔ انہیں بادشاہ کی ملکہ ہونے کا نہ صرف یہ کہ کوئی فخر نہیں تھا، بلکہ رات دن اس بات کے لیے دعا کرتی رہتی تھیں کہ اس کے پنجہ سے ان کو رہائی حاصل ہو اور اس کی قوم پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے جو عذاب آئے خدا اس میں ان کو گرفتار نہ کرے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ	اور اللہ ایمان والوں کے لیے مثال بیان
اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ	کرتا ہے فرعون کی بیوی کی۔ جب کہ
قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا	اس نے دعا کی: اے میرے رب! مجھے
فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ	لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور
وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ	مجھ کو نجات دے فرعون سے اور اس کے
الظّٰلِمِيْنَ ۝	عمل سے اور مجھے نجات دے ظالموں کی
(التحریم - ٦٦ : ١١)	قوم سے۔

---

١ یہ بھی واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بیعت لیتے وقت کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ اس آیت کے مطابق جب حضورؐ نے عورتوں سے بیعت لے رہے تھے تو عورتوں نے چاہا کہ آپ مردوں کی طرح ان کے ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت لیں مگر آپ نے فرمایا: میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، زبانی اقرار کافی ہے (سنن ابن ماجہ: کتاب الجہاد، باب بیعۃ النساء)۔ اب ارشاد ہو کہ دل کن کے زیادہ پاک ہیں؟ خدا کے رسول اور صحابیہ خواتین کے، یا ان خواتین و صاحبان کے جنہیں مصافحہ کرتے ہوئے ہم آئے دن اخبارات اور جرائد کی تصویروں میں دیکھتے ہیں؟

دوسرا نمونہ حضرت مریمؑ کا ہے جو عفت و عصمت اور طہارتِ اخلاق و پاکیزگیٔ مزاج کا پیکر مجسّم ہیں :

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ	اور اللہ مریم بنت عمران کی مثال بیان کرتا
الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	ہے جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔
فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا	پس ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور
وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا	اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس
وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ؀	کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں
(التحریم - ۶۶ : ۱۲)	برداروں میں سے تھی۔

جس طرح پیروی اور اتباع کے لیے مذکورہ بالا دو نمونے رکھے ہیں اسی طرح عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے بھی عورتوں کے سامنے دو برے کیرکٹر رکھے ہیں۔

ایک کیریکٹر تو حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کا ہے۔ ان دونوں عورتوں کو اللہ کی مہربانی سے بڑے مرتبے کے شوہر ملے تھے اور اگر یہ وفاداری اور راستبازی کے ساتھ ان کے ساتھ زندگی گزارتیں اور جس دعوتِ خیر کو وہ لوگ لے کر اُٹھے تھے اس میں اپنے مقدور بھر ان کا ہاتھ بٹاتیں اور ان کے دُکھ سُکھ میں ان کی شریکِ حال بنتیں تو ان کے شوہروں کی طرح ان کا بھی خدا کے یہاں بڑا مرتبہ ہوتا۔ لیکن انہوں نے ان کے ساتھ وفاداری کے بجائے خیانت کی، ان کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے کی جگہ ان کی دعوت کو حقیر جانا اور ان کے دشمنوں کے ساتھ سازباز رکھا، ان کے دُکھ سُکھ میں ان کے شریکِ حال ہونے کے بجائے ان سے نفرت کی اور ان کی زحمتوں میں اضافہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس عذاب میں ان کی قوم کے فساق و فجار مبتلا ہوئے اسی عذاب میں خدا نے ان کی بدکار بیویوں کو بھی پھینک دیا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ	اللہ کافروں کے لیے مثال بیان کرتا ہے
كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ	نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی۔ دونوں
لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ	ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے
عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا	نکاح میں تھیں تو انہوں نے ان کے ساتھ
فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ	بے وفائی کی تو وہ اللہ سے ان کے کچھ کام
شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ	آنے والے نہ بن سکے اور دونوں عورتوں کو
مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ○	حکم ہوا کہ پہ تم بھی دوزخ میں پڑنے والوں
(التحریم۔ ۶۶ : ۱۰)	کے ساتھ دوزخ میں پڑو۔

دوسری عبرت انگیز مثال ابولہب کی بیوی کی پیش کی ہے۔ ابولہب اس جاہلی نظام کا سب سے بڑا لیڈر تھا جو اسلامی دعوت کے ابتدائی دور میں حجاز میں قائم تھا۔ یہ ایک بدخصلت اور کمینہ آدمی تھا اور اس سے زیادہ بدخصلت اور بدذات اس کی جورو تھی۔ یہ دونوں اس دعوتِ حق کے انتہائی دشمن تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کی تہ میں کوئی اصولی چیز یا قومی و وطنی حمیت نہیں تھی۔ بلکہ صرف ان کے ذاتی اغراض اور اقتدار تھے جو دعوتِ حق کی کامیابی کی صورت میں ان کے معرضِ خطر میں نظر آتے تھے۔ ابولہب کی بیوی اپنے آرائش و زیبائش کے شوق کو پورا کرنے اور سروسامان کے لحاظ سے اپنی ہم چشموں میں ممتاز رہنے کے لیے ابولہب کو مجبور کرتی تھی کہ وہ جہاں سے اور جس طرح سے ممکن ہو اس کے لیے دولت اکٹھی کرے اور ابولہب اپنی رذالت اور کم ہمتی کی وجہ سے تمام جائز و ناجائز ذرائع اختیار کر کے اس کی خواہش پوری کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اتنا بڑا لیڈر ہونے کے باوجود وہ رفادہ[1] کا مال خرد برد کرتا تھا، بلکہ تاریخوں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ بیت اللہ کے خزانے

[1] قریش کی جاہلی حکومت میں یہ فنڈ خاص حجاج کی میزبانی کے لیے قائم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے زمانے میں اس کا انچارج ابولہب تھا۔

سے سونے کے ہرن کی چوری کا بھی اس پر شبہ کیا گیا۔ اس کی ان ساری حرکتوں کی محرک چونکہ اس کی بیوی ہی تھی اور وہ ایک ایسی بیوی تھی جو اس بات کی مثال بن سکتی تھی کہ کس طرح ایک بگڑی ہوئی عورت بسا اوقات پوری قوم کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا اور اس کے بد انجام شوہر کے انجام میں اس کو بھی شریک کیا اور اس کی تصویر پیش کی ہے کہ قیامت کے دن وہ اس لونڈی کی شکل میں اٹھائی جائے گی جو گلے میں رسیاں ڈالے ہوئے لکڑی ڈھونے کے لیے جا رہی ہو اور وہ ایندھن لا لا کر اس آگ کو بھڑکائے گی جس میں اس کا بدبخت شوہر جل رہا ہوگا. کیونکہ دنیا میں درحقیقت اس کے لیے اس آگ کے اسباب فراہم کرنے والی وہی تھی. چنانچہ قرآن نے اس عورت کو تمام مردوں اور عورتوں کے لیے ایک مثالِ عبرت کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے. ملاحظہ ہو:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝	ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور
مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝	وہ خود بھی ڈھے گا۔ نہ اس کا مال اس
سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّ	کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ بھڑکتی
امْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝	آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی ایندھن
فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝	ڈھوتی ہوئی۔ اس کی گردن میں بٹی
(اللھب - ۱۱۱ : ۱ - ۵)	ہوئی رسّی ہوگی۔

اس پوری بحث کو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ اخلاقی نصب العین ہے جو قرآن نے عورتوں کے سامنے رکھا ہے اور یہ نمونے ہیں جن کی پیروی کی دعوت دی ہے اور یہ مثالیں ہیں جن کو عبرت حاصل کرنے کے لیے پیش کیا ہے۔ اگر آپ سچ مچ قرآن

ے رشوت و خیانت کی آمدنیوں سے جو قیمتی اور بھاری بھاری ہار بنوائے جاتے اور پہنے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے وہ قیامت کے دن لکڑی ڈھونے والیوں کی رسیوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے۔

کہ اپنے لیے ضابطۂ زندگی ، مانتے یا مانتی ہیں تو بلّٰہ ارشاد ہو کہ ہے اس میں کہیں ذکرِ جلی یا خفی ناچنے والیوں اور گانے والیوں کا ، پریڈیں کرنے والیوں اور سلامیاں دینے والیوں کا ، جسم بنانے والیوں اور جسمانی کرتب دکھانے والیوں کا ، بناؤ سنگار کر کے فتنہ اٹھانے والیوں اور نوروز منانے والیوں[1] کا ، لیڈر بن کے خود گمراہ ہونے والیوں اور دوسروں کو گمراہ کرنے والیوں کا ! اور اگر کچھ مضائقہ نہ ہو تو اس سوال کا جواب بھی

---

[1] حال میں ماہنامہ طلوعِ اسلام ، کراچی (دوبت جنوری ، فروری ۱۹۵۰ء) نے ایک اطلاع شائع کی ہے جو خود اس کے الفاظ میں ہم یہاں درج کرتے ہیں :

سال نو کی آمد کی خوشی میں کراچی کے ایک بہت بڑے کلب میں نوروز کی تقریب ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء اور یکم جنوری ۱۹۵۰ء کی درمیانی شب میں شراب و شباب اور سرمستیوں اور رنگینیوں کے ساتھ اس طرح منائی گئی کہ ایک دیدہ ور تماشائی کے بیان کے مطابق تمام حکومتِ پاکستان کی اکثر بیگمات شفق سامان اور دخترانِ برق دامان مغربی نیم عریاں لباس میں ساق و سینہ کی ہوشربا جلوہ پاشیوں کے ساتھ اس محفلِ رنگ و تعطر میں غارتگرِ تمکین و ہوش بن رہی تھیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ عشائیہ (SUPPER) کے بعد میں نے پینے کے لیے پانی مانگا تو بیرے نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا جو کھلے الفاظ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ اگلے وقتوں کی بوسیدہ روح یہاں کیا کرنے آ گئی ! اس نے کہا حضور ! یہاں تو

شاہد و شمع و شراب و شکر و نقل و سرود

میں پانی کا کیا کام ! آج رات یہاں پانی کے نلوں سے شراب بہہ رہی ہے ۔

اس کے بعد محفلِ رقص شروع ہوئی ۔ حسن و عشق کے اس امتزاج بے حجابانہ سے

ہمہ اعضاء چو موجِ بادہ در جوش

ٹھیک بارہ بجے تمام بتیاں بجھا دی گئیں ۔ اس اندھیرے میں کیا کچھ ہوا آنکھوں نے دیکھا تو نہیں البتہ کان اس کی غمازی ضرور کر سکتے ہیں ۔ انگریز کے آئینِ فحاشی کے مطابق — اسی آئین کے تحت یہ مجلس منعقد ہوئی تھی — اس اندھیرے میں ہر عورت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے چوم لے ۔ ہمارے راوی کا بیان ہے کہ ایک گوشہ سے ایک ساغر شکن چوما ہٹ کے ساتھ کسی مرد کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی کہ ارے یہ کیا — ؟

اس کے جواب میں قہقہہ کی بلند ترین گمک سے فضا مرتعش ہو گئی اور ایک شوخ و شنگ آواز نے کہا : ' یہ پاکستان کا نیا کلچر ہے ! '

عنایت ہو کر آج جن "مجسم فرزندش" عورتوں کو ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے پیروی کے لیے بطورِ نمونہ رکھا جا رہا ہے قرآن کی پیش کردہ مثالوں کی روشنی میں یہ پیروی کیلیے موزوں ہیں یا عبرت کی مثالوں کے خانہ میں رکھے جانے کے لائق ہیں۔

احادیث میں عورت کے لیے اخلاقی نصب العین :

قرآن میں آپ نے دیکھ لیا کہ ایک مُسلمہ و مومنہ کے اندر وہ کن اوصاف و خصائل کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اب دوسری دینی حجت ہمارے اور آپ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔ ان پر بھی ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے کہ حضورؐ نے مسلمان بیبیوں کو کن اوصاف و خصائل کی تعلیم فرمائی ہے۔

خانہ داری :

حضرت اسماء بنت یزیدؓ کے متعلق جو مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن ہیں کتاب الاستیعاب فی اسماء الاصحاب میں مندرجہ ذیل بیان ملتا ہے :

كانت من ذوات العقل	حضرت اسماء بنت یزیدؓ عقلمند اور دیندار
والدين۔ روى عنها، انها	خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ ان سے روایت ہے
أتت النبي صلى الله عليه وسلم	کہ وہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
فقالت: انى رسول من ورائى	میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ میں عورتوں کی
من جماعة نساء المسلمين	ایک جماعت کی نمائندہ بن کر حاضرِ خدمت ہوئی
كلهن يقلن بقولى وعلى مثل	ہوں۔ وہ سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں
رائى۔ ان الله تعالى بعثك	عرض کر رہی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں
الى الرجال والنساء فآمنا بك	جو میں پیش کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ

عربی	اردو
واتبعناك ونحن معشر النساء	کو مردوں اور عورتوں' دونوں کے لیے رسول
مقصورات مخدرات	بنا کر بھیجا ہے. چنانچہ ہم آپ پر ایمان لائیں
قواعد بيوت ومواضع	اور ہم نے آپ کی پیروی کی. لیکن ہم عورتیں
شهوات الرجال وحاملات	پردہ نشین: گھروں کے اندر بیٹھنے والیاں' مَردوں
اولادهم وان الرجال فضلوا	کی خواہشات کا محل اور ان کے بچوں کو اٹھانے
بالجمعات وشهود الجنائز	والیاں ہیں. مرد ہم سے جمعہ، جنازہ و جہاد میں
والجهاد واذا خرجوا للجهاد	بازی لے گئے. جب وہ جہاد کے لیے جاتے ہیں
حفظنا اموالهم وربينا	تو ہم ان کے گھربار کی حفاظت کرتی ہیں اور ان
اولادهم افنشاركهم في	کے بچوں کو پالتی ہیں. تو کیا اجر میں بھی ہم ان
الاجر، يارسول الله ؟ فالتفت	کے ساتھ حصہ پائیں گی. یا رسول اللہ ؟ رسول اللہ
رسول الله صلّى الله عليه وسلّم	صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی طرف رخ کرکے
بوجهه الى اصحابه، فقال:	فرمایا کہ کیا تم نے کسی عورت کی گفتگو سنی ہے
هل سمعتم مقالة امرأة احسن	جس نے اپنے دین کے بارہ میں اس سے زیادہ
سوالاً عن دينه من هذه ؟	خوبی کے ساتھ سوال کیا ہو؟ سب بولے: نہیں
فقالوا: لا، والله، يارسول الله!	خدا کی قسم، یا رسول اللہ! اس کے بعد رسول اللہ
فقال رسول الله صلّى الله عليه	صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماءؓ سے مخاطب
وسلّم: انصرفي، يا اسماء! واعلمي	ہو کر فرمایا: اے اسماء: میری مدد کر اور جن
من وراءك من النساء ان حسن	عورتوں نے تم کو نمائندہ بنا کر بھیجا ہے ان کو
تبعل احدكن لزوجها و	میری طرف سے یہ بات پہنچا دو کہ تمہارا اچھی
طلبها لمرضاته واتباعها	طرح خانہ داری کرنا، اپنے شوہروں کی رضا جوئی
لموافقته يعدل كل ما	کرنا اور ان کے ساتھ سازگاری رکھنے کے لیے

ذكرت من الرجال. فانصرفت اسماء وهي تهلل وتكبر استبشارًا بما قال لها رسول الله صلى الله عليه وسلم[1]۔

ان کی پیروی کرنا ان ساری باتوں کے بارے جو تم نے مردوں کی بیان کی ہیں۔ حضرت اسماءؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کو سن کر خوش خوش خدا کی حمد و تکبیر کرتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

ایک دوسری مشہور حدیث ہے :

والمرأة راعية على بيت بعلها وولده وهي مسئولة عنهم[2]۔

اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگہبان بنائی گئی ہے اور اس سے ان چیزوں کے بارے میں پرسش ہوگی۔

لندن میں بسی ہوئی، سرخی پوڈر سے لپی ہوئی، شوخی و نزاکت سے بھری ہوئی بیوی کے مقابل میں اس ملگجی بیوی کا درجہ و مرتبہ ملاحظہ ہو جو گھر کے کام کاج، شوہر کی خدمت میں رات دن مصروف رہنے والی ہے اور جس کے چہرے بشرے سے محنت کی تکان بھی نمایاں ہے اور باورچی خانے کے دھوئیں کا ملگجاپن بھی ظاہر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : انا وامرأة سفعاء الخدين كهاتين يوم القيامة[3]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اور ملگجے گالوں والی عورت قیامت کے دن — راوی کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو برابر کرتے ہوئے فرمایا — اس طرح ہوں گے۔

---

[1] کتاب الاستیعاب فی اسماء الاصحاب لابن عبد البر، ج ۲، ص ۷۰۹

[2] سنن ابی داؤد : کتاب الخراج والامارة والفئ، باب ۱

[3] سنن ابی داؤد : کتاب الادب، باب ۱۲۱

آئیڈیل بیوی :

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک آئیڈیل بیوی کے اوصاف نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائے ہیں :

الا اخبرك بخیر ما یكنز	میں بتاؤں نہیں آدمی کا بہترین خزانہ کیا ہے؟
المرء ؟ المرأة الصالحة	نیک بیوی، جب اس کو دیکھے تو وہ خوش کرے
اذا نظر الیها سرته و	جب کسی بات کا حکم دے تو اس کی اطاعت کرے
اذا امرها اطاعته و اذا	اور جب وہ کہیں باہر جائے تو اس کے گھر اور
غاب عنها حفظته[1] ۔	بچوں اور ناموس ؛ ہر چیز کی حفاظت کرے ۔

مردوں کی ریس کرنے والی عورت :

جو عورتیں شکل و روپ میں، وضع و لباس میں، انداز و اطوار میں، مشاغل اور دلچسپیوں میں مردوں کی نقل اڑاتی ہیں، ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے :

عن ابن عباس، عن النبی صلی	حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت ہے
اللہ علیہ وسلم انہ لعن المتشبھات	کہ مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں
من النساء بالرجال ۔	پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے ۔
عن ابی ھریرۃ، قال: لعن	حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب ۳۲

[2] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب لباس النساء

وسلم الرجل يلبس لبسة المرأة و	ہے اس مرد پر جو عورتوں کا سا لباس پہنے اور
المرأة تلبس لبسة الرجل۔[1]	اس عورت پر جو مردوں کا سا لباس اختیار کرے۔
قیل لعائشة : ان امرأة	حضرت عائشہؓ کے سامنے ذکر آیا کہ ایک
تلبس النعل، فقالت : لعن	عورت ہے جو مردوں کے سے جوتے پہنتی ہے۔
رسول الله صلی الله علیه	انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وسلم الرجلة من النساء۔[2]	نے زنانِ مذکر پر لعنت کی ہے۔

ہرجائی عورت :

جو عورتیں سوسائٹی میں اپنے آپ کو دھنسانے یا باصطلاحِ جدید (MOVE) کرنے کی دلدادہ ہوتی ہیں ان کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے :

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی	حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی
الله علیه وسلم، قال : اذا	اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عورت خوشبو
استعطرت المرأة فمرت	لگا کے دوسروں کے پاس سے اس لیے
علی قوم لیجدوا ریحها	گزرے کہ وہ اس کی خوشبو سے محظوظ ہوں تو
فهی کذا وکذا قال قولاً شدیدا۔[3]	وہ عورت ایسی ایسی ہے۔ آپ نے نہایت سخت الفاظ میں اس کے لیے وعید سنائی۔
عن عائشة قالت : انی سمعت	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے

---

1. سنن ابی داؤد : کتاب اللباس، باب لباس النساء۔
2. سنن ابی داؤد : کتاب اللباس، باب لباس النساء۔
3. سنن ابی داؤد : کتاب الترجل، باب ما جاء فی المرأة تتطیب للخروج۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ
یقول: ما من امراۃ تخلع | جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی اور جگہ اپنے کپڑے
ثیابہا فی غیر بیتہا الا | اتارتی ہے وہ اس پردہ کو چاک کر دیتی ہے جو اس
ھتکت ما بینہا و بین | کے اور اللہ کے درمیان ہے۔
اللہ تعالیٰ[1]

ایک دوسری حدیث میں ہے:

مثل الرافلۃ فی الزینۃ | جو عورت بنی سنوری ہوئی دوسرے مردوں
فی غیر اھلہا کمثل ظلمۃ | میں ناز و ادا کے ساتھ چل رہی ہے اس کی مثال
یوم القیمۃ لا نور لہا[2] | قیامت کے دن کی تاریکی کی ہے جس کے لیے کوئی
روشنی نہیں۔

فیشن ایبل عورتیں:

جو عورتیں مصنوعی حسن کی دلدادہ ہوتی ہیں اور اس کے لیے جسم سازی اور خود نمائی کے نت نئے طریقے ایجاد کرتی ہیں، یہاں تک کہ فطری ساخت بدل دینے کے لیے بھی طرح طرح کے جتن کرتی ہیں، جو لباس کو جسم کے چھپانے کے بجائے اس کے محاسن کو نمایاں کرنے کے لیے پہنتی ہیں اور ایسے ایسے فیشن ایجاد کرتی ہیں کہ عورت کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہتی ہے، ان کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

عن عبد اللہ قال: لعن | حضرت عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | صلی اللہ علیہ وسلم نے مصنوعی بال لگانے
الواصلۃ والمستوصلۃ والواشمۃ | والیوں اور لگوانے والیوں اور گودنے والیوں

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الحمام، باب ۱
[2] جامع ترمذی، کتاب الرضاع، باب ۱۳

والمستوشمة ۔[1] — اور گدوانے والیوں پر لعنت کی ہے۔

ایک دوسری روایت ہے:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عشر: عن الوشر والوشم والنتف... وعن مکامعة المرأة المرأة بغیر شعار[2] ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس چیزوں سے منع فرمایا ہے: ایک دانتوں کو نکیلا اور چمکدار بنوانے سے، دوسرے گدنے سے، تیسرے حاجب ابرو کے نوک پلک نکلوانے سے... چوتھے اس بات سے کہ عورت عورت کے ساتھ بغیر لباس کے ہم آغوش ہو۔

بعض روایات میں اس ضمن میں 'متنمصات' کا لفظ بھی آیا ہے جس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو نوک پلک درست کرنے کے لیے ابرو کے بال اکھڑوا دیتی ہیں نیز 'متفلجات للحسن' اور 'المغیرات خلق اللہ' کے الفاظ بھی آئے ہیں جن سے مراد وہ عورتیں ہیں جو خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے اپنے دانتوں میں مصنوعی فصل پیدا کرتی ہیں اور اپنی قدرتی ساخت کی ۔ اپنے زعم کے مطابق — دوسری ناہمواریوں کو درست کراتی ہیں[3] ۔

اسی سلسلہ میں یہ حدیث بھی نہایت اہم ہے:

---

1. سنن ابی داؤد: کتاب الترجل، باب ۵
2. سنن ابی داؤد: کتاب اللباس، باب ۸
3. ان حدیثوں میں جن چیزوں کا ذکر آیا ہے وہ عرب جاہلیت کی شوقین اور فیشن ایبل عورتیں بناؤ (میک اپ) کے خیال سے کرتی تھیں۔ آپ اس فہرست میں ان چیزوں کا اضافہ کر لیجیے جو جاہلیت جدیدہ نے ان مقاصد کے لیے ایجاد کی ہیں۔ ان احادیث میں نفس بناؤ سنگھار کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس غیر فطری بناؤ کی ممانعت ہے جس میں عورت قدرت کی صنعت کی اصلاح کے درپے ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی چیز کے درست کر لینے کے بجائے قدرت کی بنائی ہوئی چیز کو بگاڑنے کی سعی کرتی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات رؤسھن کاسنمۃ البخت المائلۃ لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو عورتیں کپڑے پہن کے بھی ننگی ہی رہتی ہیں اور اپنے اعضا کو لچکاتی ہوئی اور لچکتی ہوئی چلتی ہیں، جن کی گردنیں بختی اونٹ کی طرح ناز سے ٹیڑھی رہتی ہیں، نہ وہ جنت میں داخل ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی۔

عفت کی اہمیت:

عفت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل احادیث سے ہو سکے گا:

اتقوا اللہ فی النساء۔ فانکم اخذتموھن بامانۃ اللہ واستحللتم فروجھن بکلمۃ اللہ۔ وان لکم علیھن ان لا یؤطئن فرشکم احدا تکرھونہ۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ لوگو، عورتوں کے حقوق کے بارہ میں خدا سے ڈرتے رہو۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کی حیثیت سے لیا اور اللہ کے کلمہ کے ذریعہ سے ان کے جسموں کو اپنے لیے جائز بنایا ہے اور تمہارا ان کے اوپر یہ حق ہے کہ کسی غیر مطلوب سے تمہارے بستر کو پامال نہ کرائیں۔

زنا العینین النظر، وزنا اللسان المنطق، والنفس

آنکھوں کا زنا بدنگاہی، اور زبان کا زنا گفتگو ہے۔ نفس ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے

---

[1] صحیح مسلم: کتاب اللباس والزینۃ، باب ۳۴

[2] سنن ابی داؤد: کتاب المناسک، باب ۵۶

ممنى وتشتهى، والفرج يصدق ذلك ويكذبه[1]	اور شرمگاہ اس کی تصدیق و تکذیب کرتی ہے۔

ان احادیث پر ایک نظر ڈال کر اندازہ فرمائیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے کیا اخلاق اور کیا خصائل پسند فرمائے ہیں اور کن اخلاق اور کن خصائل کو ناپسند فرمایا ہے اور پھر ان کو سامنے رکھ کر ان اخلاقی تصورات کا جائزہ لیجیے جن کو آج ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے اندر مقبول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دونوں کا موازنہ کر کے دیکھیے کہ ان دونوں میں کوئی دور قریب کی نسبت ہے؟ کھینچ تان کرنے کی جتنی گنجائش بھی ممکن ہو آپ کو آزادی حاصل ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیے اور 'وقت کے تقاضوں' کی جو اصطلاح آپ نے ایجاد فرمائی ہے اس کا حق بھی آپ جس قدر رکھنا چاہتے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ فیاضی کے ساتھ محفوظ کر لیجیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ آپ کے اخلاقی تصورات کے سانچے میں اور اس قرآنی و نبوی سانچہ میں کوئی مناسبت بھی ہے؟ 'وقت کے تقاضوں' سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے، لیکن وقت کے تقاضوں کی خاطر جاہلیت کو اسلام اور کفر کو ایمان کی جگہ تو نہیں دی جا سکتی۔ اگر کسی کو 'وقت کے تقاضوں' کے پیچھے اس طرح بگٹٹ بھاگنا ہے کہ اسے کفر و اسلام سے کوئی بحث ہی نہیں رہی ہے تو وہ جائے جس گڑھے میں چاہے گر جائے' لیکن پھر اسے اسلام اسلام پکارتے رہنے کا کیا حق ہے؟ اس سے کس نے کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ قرار داد مقاصد بھی پاس کرے اور جگہ جگہ مسلمانوں سے کہتا پھرے کہ ہم تو اسلام کو اس کی اصل شکل اور سپرٹ میں از سر نو قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اگر وقت کے تقاضوں نے اسے بتا دیا ہے کہ پسندیدہ سانچہ ہالی وڈ کا سانچہ ہے تو وہ شوق سے اس سانچہ میں ڈھل جائے، لیکن پھر یہ کیا بوالفضولی ہے کہ جگہ جگہ میلاد کی مجلسوں میں وہ وعظ کرتا پھرے کہ 'دنیا کی مشکلات کا حل اگر ہے تو پیغمبرؐ کی تعلیم میں ہے'۔

---

[1] سنن ابی داؤد: کتاب النکاح، باب ۴۳

باب ۵

حکومت میں عورتوں کی مساویانہ حصّہ داری کے عقلی دلائل اور اُن پر تبصرہ

آزادیٔ نسواں کے علمبرداروں نے اپنی حمایت میں مذہب کو استعمال کرنے کی جو کوشش کی ہے، پچھلے صفحات میں اس کی اصل حقیقت ہم نے بے نقاب کر دی ہے۔ ہماری پوری بحث جو شخص بھی غور سے مطالعہ کرے گا، ہمارے نقطۂ نظر سے متفق ہو یا نہ ہو لیکن وہ اس امر سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اسلام ان نئے مصلحین کی 'اصلاحات' کی نہ صرف یہ کہ تائید نہیں کرتا، بلکہ ان کا شدید ترین مخالف ہے۔ لیکن یہ حضرات عورتوں اور مردوں کی سیاسی مساوات اور انتظام ریاست میں عورتوں کی مساویانہ[1] حصہ داری کی حمایت میں بعض عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں جن سے ہم ابھی تک تعرّض نہیں کر سکے ہیں، اور یہ بحث ناتمام رہ جائے گی اگر ہم ان عقلی دلائل پر بھی تبصرہ کر کے ان کی حقیقت بھی اسی طرح واضح نہ کر دیں جس طرح ہم نے ان کی مذہبی نمائش کی قلعی کھول دی ہے۔ تاکہ جس طرح یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی ہے کہ ان حضرات کو مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جائے

---

[1] یہ اچھی طرح ملحوظ خاطر رہے کہ ہم انتظام ریاست میں عورتوں کی حصہ داری کے مخالف نہیں ہیں۔ ہم صرف اس حصہ داری کے مخالف ہیں جو مرد و زن کی مساوات کے مغربی نظریہ پر مبنی ہے۔ آگے چل کر ہم اسلامی نظریۂ مساوات کے تحت عورت کے اجتماعی و سیاسی حقوق کی نوعیت ان شاء اللہ تفصیل کے ساتھ واضح کریں گے۔

کہ عقل سے بھی ان لوگوں کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

اگرچہ ہماری اصل ذمہ داری صرف انہی دلائل سے تعرض کرنا ہے جو ہمارے ملک کے ارباب کار وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں، لیکن ہم ان لوگوں کے ساتھ فیاضانہ معاملہ کریں گے اور اُن کے اُن سارے دلائل سے تعرض کریں گے جو مل کے زمانہ سے لے کر اب تک انتظام ریاست میں عورتوں کی حصہ داری کی حمایت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس فیاضی کی وجہ سے بحث کچھ طویل ضرور ہو جائے گی، لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ آزادیٔ نسواں کی تحریک کی ابتدا سے لے کر اب تک اس سلسلہ میں عقلی رنگ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب کا سب یکجا سامنے آجائے گا اور سارے دلائل کی حقیقت کھل جائے گی، جس کے بعد یہ اندیشہ باقی نہ رہے گا کہ اس ترکش میں کوئی اور تیر بھی ہے جس کو حریف استعمال کر سکے گا۔ اس بحث کو پڑھتے وقت یہ امر ملحوظ رہے کہ اس میں ہم صرف مل اور اس کے ہم خیالوں کے دلائل کا ضعف بیان کریں گے، اپنے ان عقلی دلائل کی تفصیل نہیں کریں گے جن کی بنا پر ہم عورت کی سیاسی و معاشی سرگرمیوں کے مخالف ہیں۔ ان دلائل کی تفصیل اس کے بعد والے باب میں آئے گی اور وہ باب اس باب ہی کا ایک حصہ ہے، اس لیے اُس کو پڑھے ہوئے تنہا اس باب کو پڑھ کر کوئی رائے نہ قائم کیجیے۔

پہلی دلیل:

نظام ریاست میں عورتوں کی براہِ راست اور مساویانہ حصہ داری کی پہلی دلیل یہاں سے پیدا کی جاتی ہے کہ جب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہر باشندۂ ملک اس بات کا حقدار ہے کہ اس پر اچھی طرح حکومت کی جائے اور یہ بھی تسلیم شدہ ہے کہ اس حق سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہے جب تک انتظام ریاست میں

باشندگانِ ملک کے لیے نمائندگی کا حق تسلیم نہ کیا جائے تو جس طرح مرد ان دونوں چیزوں کے حقدار تسلیم کیے گئے ہیں اسی طرح عورتوں کے لیے بھی یہ دونوں حق تسلیم کیے جانے چاہئیں۔ عورتیں بھی مردوں ہی کی طرح حق رکھتی ہیں کہ ان پر عمدہ طریق سے حکومت کی جائے اور پھر اس حق سے لازمی طور پر یہ حق بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کو براہِ راست اور مساویانہ حیثیت سے نظامِ حکومت میں حصّہ لینے کا موقع دیا جائے۔

اوّل تو اس استدلال میں ایک چیز خواہ مخواہ کو فرض کر لی گئی ہے۔ وہ یہ کہ حکومت میں براہِ راست نمائندگی اچھی حکومت کے لیے ضامن ہے۔ اچھی حکومت اور نمائندگی میں کوئی لزوم تو درکنار سرے سے کسی قسم کا ربط ہی موجود نہیں ہے۔ حکومت کی اچھائی یا برائی ایک علیحدہ چیز ہے اور اس میں نمائندگی ایک علیحدہ شے ہے۔ حکومت کی اچھائی دو باتوں پر منحصر ہے، ایک یہ کہ حکومت جن اصولوں پر قائم ہے وہ بجائے خود اچھے ہوں، دوسری یہ کہ اس کا انتظام جن ہاتھوں میں سپرد کیا جائے وہ امن اور عدل کے صحیح اصولوں پر ایمان رکھتے ہوں اور ان پر عمل کرنے کی انہوں نے تربیت پائی ہو۔ اگر یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں تو پھر ناممکن ہے کہ مجرد نمائندگی کے بل پر اچھی حکومت حاصل کی جا سکے۔ یہ دونوں چیزیں جس حکومت کے اندر موجود ہوں عورتوں کو اس کے اندر نمائندگی حاصل ہو یا نہ ہو لیکن ان کو اچھی حکومت ضرور حاصل ہوگی۔ لیکن اگر یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں تو عورتیں تو درکنار مردوں کو بھی اچھی حکومت حاصل نہیں ہو سکتی، اگرچہ ان کو اس کے اندر سو فی صد نمائندگی حاصل ہو۔ ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں قدیم یونان کی ان شہری جمہورتیوں کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں ملک کا ہر باشندہ انتظامِ ملک میں براہِ راست حصّہ لیتا تھا، اور اس زمانہ کی جمہوریتوں کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں باشندگانِ ملک کی نمائندہ حکومتیں قائم ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی نظامِ نمائندگی بھی ملک کے باشندوں کے لیے اچھی حکومت

مہیا کر سکا؟ آج دنیا میں متعدد حکومتیں ایسی موجود ہیں جن میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ کیا ان حکومتوں نے عورتوں کے لیے فی الواقع اچھی حکومت مہیا کر دی ہے؟ کیا انگلستان، امریکہ اور ترکیہ میں مظلوم مردوں اور مظلوم عورتوں کی وہ ساری قسمیں موجود نہیں ہیں جو ان ممالک میں موجود ہیں جن میں نمائندگی کے یہ سیع اصول بھی اختیار نہیں کیے گئے ہیں؟ ان کے برعکس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت کو لیجیے۔ اس میں امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں کی طرح، اگرچہ عورتوں کو نمائندگی حاصل نہ تھی تاہم اس حکومت کے اندر عراق کے شہروں میں بسنے والی ایک بیوہ اور صنعاء کے پہاڑوں میں بکریاں چرانے والی ایک لونڈی کی ضروریات کی بھی پوری پوری خبر رکھی جاتی تھی اور حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ اگر میں زندہ رہ گیا تو اپنے بعد عراق کی بیواؤں کو کسی کا دستِ نگر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

دوسرے اس استدلال میں کھلا ہوا منطقی ضعف موجود ہے۔ اس کا تجزیہ کر کے دیکھیے تو اس کے دو جزو ہیں: ایک یہ کہ ہر باشندۂ ملک کو یہ فطری حق حاصل ہے کہ اس پر عمدہ طریق سے حکومت کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اس حق سے متمتع ہونے کے لیے لازماً اس کو انتظامِ مملکت میں براہِ راست حصہ بھی ملنا چاہیے۔ اس کا پہلا جزو تو بالکل صحیح ہے۔ اس سے کسی شخص کے لیے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس کا دوسرا جزو محلِ بحث و نظر ہے۔ اگر عمدہ طریقہ سے حکومت کیے جانے کے لیے انتظامِ حکومت میں براہِ راست حصہ داری لازمی ہے تو یہ حق بچوں کو بدرجۂ اولیٰ حاصل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اچھی طرح حکومت کیے جانے کے حق دار ہونے میں وہ عورتوں سے کم نہیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی حقدار ہیں۔ لیکن ان کے اچھی حکومت کے حق کو تو بلا کسی بحث و اختلاف کے ہر شخص تسلیم کرتا ہے، مگر اس حق کی بنا پر انتظامِ حکومت میں ان کی براہِ راست نمائندگی کے حق کا کوئی بھی مطالبہ نہیں کرتا۔

اس استدلال میں اصلی غلطی یہ ہے کہ ایک شخص کے مستقل اور غیر مشروط حق اور

اس کے منافی اور مشروط حق میں فرق نہیں کیا گیا ہے۔ ہر باشندۂ ملک کا یہ حق کہ اس پر عدل و انصاف اور رحم و شفقت کے ساتھ حکومت کی جائے اس کا ایک ذاتی اور مستقل حق ہے جو محض اس بات پر قائم ہے کہ وہ مملکت کا ایک شہری ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ عالم ہے یا جاہل، ذہین ہے یا کودن، ضعیف ہے یا طاقتور، مریض یا تندرست، عاقل ہے یا فرزانہ، جوان ہے یا بوڑھا۔ ان ساری چیزوں سے قطع نظر تنہا یہ بات کہ وہ حکومت کا شہری ہے اس کو اس بات کا حقدار بناتی ہے کہ اس پر عمدہ طریقے سے حکومت کی جائے۔ یہ حق کسی شرط کے ساتھ مشروط و مقید نہیں ہے۔ اس کے برعکس انتظام حکومت میں نمائندگی کا حق شخصی صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کے لیے تنہا یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص ملک کا باشندہ ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انتظام مملکت کی ذمہ داریوں کو اٹھا بھی سکتا ہو۔ ان دونوں قسم کے حقوق کو خلط ملط کرنا اور ان میں سے ایک کو دوسرے کے لیے بطور دلیل استعمال کرنا ایک صریح مغالطہ ہے۔ عورتوں کا یہ حق کہ ان پر عمدہ طریق سے حکومت کی جائے، ایک غیر مشروط حق ہے جو ان کو بہر حال حاصل ہونا چاہیے۔ باقی رہا یہ حق کہ ان کو انتظام حکومت میں براہ راست حصہ ملنا چاہیے تو یہ صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے اور جب تک اس کے لیے ان کی صلاحیت دلائل کے ساتھ نہ ثابت کر دی جائے ان کی طرف سے اس حق کا مطالبہ ایک بے دلیل مطالبہ ہے۔

دوسری دلیل:

دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جب خاندانی نظام کے اندر عورت کے حق ملکیت اور اس کے تصرف کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور ہر معاملہ میں مردوں کی اجارہ داری کا قدیم اصول باقی نہیں رہا اور تجربہ نے اس کا مفید ہونا بھی ثابت کر دیا تو پھر یہی حق عورتوں کے لیے اجتماعی و سیاسی دائرہ کے اندر بھی کیوں نہ تسلیم کیا جائے؟ یہ کیا ظلم ہے کہ

عورتوں سے ٹیکس کے لیے تو مطالبہ کیا جائے، لیکن اس کے خرچ سے متعلق ان کی رائے نہ دریافت کی جائے؟ جب عورت نے اندرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کے لیے اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دے دیا تو بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کے لیے اُسے کیوں نااہل سمجھا جائے؟ جو مساوات پرائیویٹ زندگی کے اندر خیر کا باعث ہوئی ہے آخر وہ اجتماعی معاملات میں کیوں مضر ثابت ہو گی؟

یہ دلیل ان کی شاندار دلیلوں میں سے ہے، لیکن غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب ایک صحیح کام کو دلیل بنا کر لوگوں سے ایک غلط کام کے لیے مطالبہ فرماتے ہیں۔ اگر عورتوں کو خاندان کے نظام میں بالکل بے دست و پا بنا کے رکھ چھوڑا گیا تھا تو یہ ایک غلطی تھی اور اگر اس غلطی کی اصلاح کر دی گئی اور عورتوں کو خاندان کے اندر ان کے جائز حقوق و اختیارات سونپ دیے گئے تو یہ ایک نہایت منصفانہ اور عادلانہ بات ہوئی۔ لیکن اس چیز کو دلیل بنا کر یہ مطالبہ کرنا کہ جس طرح گھر کا انتظام تم نے عورت کو سونپ دیا اسی طرح سلطنت کا انتظام بھی عورت کو سونپ دو بالکل مہمل بات ہے۔ گھر کا انتظام اگر عورت کے سپرد کر دیا گیا تو یہ تو "حق بحقدار رسید" کا معاملہ ہوا اور عقل اور فطرت کی شہادت اس کارروائی کی صحت کی تصدیق کرتی ہے، لیکن اس سے یہ بات کہاں سے ثابت ہوتی ہے کہ انتظامِ سلطنت میں عورت کو حصہ دار بنا دینا بھی صحیح ہے؟ یہ بات کہ عورت نے گھر کے انتظام کو اچھی طرح سنبھال لیا ہے اس لیے وہ سلطنت کی ذمہ داریوں کو بھی اچھی طرح سنبھال لے گی، اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اگر ایک شخص اچھا معلم یا اچھا ڈاکٹر ہو سکتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ایک اچھا سپہ سالار اور ایک مدبر حکمران بھی ہو سکتا ہے۔ گھر کے انتظام اور سلطنت کے انتظام کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق نہ سہی، تاہم غلط ضرور ہے۔ اور یہ بات بھی بالکل خلافِ واقعہ ہے کہ پرائیویٹ زندگی کے اندر عورت اور مرد کی

مساوات مفید ثابت ہوئی ہے، اس لیے اجتماعی زندگی کے اندر بھی یہ مفید ہو سکتی ہے۔ بل کے زمانہ تک پرائیویٹ زندگی کے اندر عورت اور مرد کی مساوات نہ تو صحیح معنوں میں وجود میں آئی تھی اور نہ لوگ اس کے اصل نتائج کا کچھ اندازہ کر پائے تھے۔ لیکن اب تو ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ یورپ و امریکہ میں اس 'مساوات' نے خاندان کے نظام کو تہ و بالا کر دیا ہے اور انگلستان و امریکہ کے اہلِ نظر، جیسا کہ ہم آگے چل کر دکھائیں گے، اس کے ہولناک نتائج سے نہایت پریشان ہیں۔ بلکہ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر خاندان کے نظام کو جلد انتشار سے نہ بچایا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ سلطنت کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہو گا۔

عورت کا ٹیکس دینا بھی اس کے لیے انتظامِ سلطنت میں حصہ دار ہونے کا حق نہیں پیدا کرتا۔ ٹیکس تو درحقیقت معاوضہ ہے اس حفاظت اور حقِ ملکیت کا جو سلطنت کے ذریعہ سے ایک شہری کو حاصل ہوتا ہے۔ جس کو سلطنت کی بدولت جان و مال کی حفاظت اور ملکیت کے حقوق حاصل ہوتے ہیں، اس کا فرض ہے کہ وہ سلطنت کو ٹیکس ادا کرے۔ ٹیکس سلطنت میں حصہ داری کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ جو یہ قیمت ادا کر دے اس کے لیے انتظامِ سلطنت میں جگہ مخصوص ہو جائے۔ انتظامِ سلطنت میں حصہ داری کے لیے دوسری چیزیں مطلوب ہیں، جن میں سب سے مقدم اس کے لیے صلاحیت ہے۔

تیسری دلیل:

ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ بہت سی قومیں، جو عورت کے لیے کسی قسم کا بھی سیاسی حق تسلیم نہیں کرتی ہیں، بسا اوقات سلطنت کا حکمران ایک عورت کو بنا دیتی ہیں۔ پھر جب عورت کے لیے سلطنت کا مقتدرِ اعلیٰ کے منصب پر متمکن ہونا جائز سمجھا جاتا ہے تو عام شہری کی حیثیت سے انتظامِ ملک میں اس کی شرکت کو تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

یہ دلیل اوّل تو تمام قوموں پر حجت نہیں ہو سکتی، کیونکہ بہت سی قومیں عورت کی حکمرانی کو اصولاً غلط قرار دیتی ہیں۔ ثانیاً یہ دلیل بنائے باطل علی الباطل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ بعض قوموں نے اپنی حماقت سے یا کسی سبب سے فلاں غلطی کا ارتکاب کیا ہے اس لیے ہم سب لوگوں کو مل کر اسی بنیاد پر فلاں غلطی کا ارتکاب کر ڈالنا چاہیے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تاریخ میں عورتوں کے حکمران ہونے کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ تمام تر شخصی اور خاندانی سلطنتوں سے تعلق رکھتی ہیں، جن میں سلطنت کسی خاص شخص یا خاندان کی ملکیتِ ذاتی سمجھی جاتی ہے اور تختِ سلطنت کو مورث سے وارث کی طرف منتقل ہونے والی ایک جائداد قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی سلطنتوں کے اندر اگر اولادِ اکبر کے وارث ہونے کا قانون نافذ رہا ہے اور اولادِ اکبر کوئی عورت ہی ہوئی ہے تو وہ حکمران بن گئی ہے۔ یا یہ ہوا ہے کہ مورث نے کوئی اولادِ نرینہ سرے سے چھوڑی ہی نہیں ہے، صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں اس نے وارث چھوڑی ہیں تو ان میں سے کسی صُغریٰ یا کُبریٰ نے تختِ سلطنت سنبھال لیا ہے۔

یہ نظام بجائے خود از ابتدا تا انتہا باطل اور خلافِ عقل ہے۔ نہ سلطنت کسی خاندان یا شخص کی ملکِ ذاتی ہو سکتی ہے، نہ تختِ سلطنت وراثت میں منتقل ہونے والی کوئی شے ہے، نہ سابق حکمران کی اولاد کے وارثِ سلطنت ہونے کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود ہے۔ پھر جس نظام کا کوئی جزو بھی صحیح نہ ہو اس کو دلیل بنا کر اگر کوئی بات ثابت کی جائے گی تو وہ کس طرح صحیح ہو گی؟ اگر اس دلیل کی بنا پر عورت کی انتظامِ ملک میں حصہ داری کو ثابت کیا جا سکتا ہے تو اس سے نابالغ بچوں کے استحقاقِ حکمرانی وحقِ نمائندگی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ متعدد سلطنتوں میں نابالغ بچوں کے حکمران بننے کی مثالیں ملتی ہیں۔ پھر جب وہ حکمران بن سکتے ہیں تو تمام شہریوں کی حیثیت سے انتظامِ ملک میں حصہ کیوں نہیں لے سکتے؟ لیکن نہ تو مِل صاحب اس

کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ کوئی اور اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوگا۔

چوتھی دلیل:

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اگر عورتوں کو نمائندگی اور ووٹ کا حق دیا جائے تو چونکہ ہر عورت خاندان کے ساتھ رہتی ہے اس لیے وہ لازماً سرپرستِ خاندان کا ساتھ دے گی۔ بیوی ووٹ میں شوہر کے ساتھ جائے گی اور لڑکی باپ کے ساتھ۔ اس طرح خاندانوں کے سرپرستوں کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہوگا اور خاندان کے نظام کو تقویت حاصل ہوگی اور خاندان چونکہ ریاست کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس لیے خاندان کا یہ استحکام خود ریاست کے استحکام کا سبب ہوگا۔

مل نے اس دلیل سے ان لوگوں کو چپ کرانے کی کوشش کی ہے جو حکومت میں عورتوں کی نمائندگی پر اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے خاندان کے نظام میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مل کی یہ دلیل خود اس کے سیاسی نظریات کی کمر توڑ دینے والی ہے۔ اگر مل کا یہ اندازہ صحیح [1] ہے کہ ہر عورت لازماً ووٹ میں اپنے سرپرستِ خاندان کے ساتھ جائے گی تو عورتوں کو حکومت میں حقِ نمائندگی دینا ایک بالکل ہی غیر ضروری اور بے معنی بات ہوئی کیونکہ اس صورت میں تو اصل نمائندگی مردوں ہی کی ہوئی صرف اتنا فرق ہوا کہ عورتوں نے مل کر اپنے مردوں ہی کے ووٹوں میں اضافہ کر

---

[1] بھوی پارلیمنٹ کے بجٹ سیشن (مارچ ۱۹۵۰ء) میں بیگم شائستہ اکرام اللہ نے مل صاحب کے اس ان کی تصدیق کر دی۔ بیگم صاحبہ نے مرکزی حکومت کے سیکرٹری لوگوں کی تنخواہوں کے لیے پارلیمنٹ اس زور سے لڑائی کی کہ دیکھنے والوں نے حیران ہو ہو کر کہنا شروع کر دیا کہ اے کاش: بیگم صاحبہ لوگوں کے لیے جنہوں نے اُن کو اپنا نمائندہ بنا کر پارلیمنٹ میں بھیجا ہے، اس سے نصف ہی کا اظہار فرماتیں۔ یاد رہے کہ مسٹر اکرام اللہ یعنی بیگم موصوفہ کے شوہر بھی حکومتِ پاکستان محکمہ کے سیکرٹری ہیں۔

دیا اور اگر حل کے اندازہ کے برعکس صورت واقعہ اس سے مختلف نکلے یعنی عورت بھی سیاست میں اپنا اُتّوُلُ لگانے لگ جائے تو اس نمائندگی کے فیض سے ہر گھر سیاسی نظریات کے تصادم کا ایک اکھاڑا بن جائے گا۔ میاں اگر آمریت کے علمبردار ہوں گے تو بیوی صاحبہ جمہوریت کی، والد بزرگوار اگر لبرلزم کے حامی ہوں تو صاحبزادی صاحبہ کمیونزم کی اور اس انتشارِ فکر کا لازمی نتیجہ صرف یہ نکلے گا کہ گھر گھر نہیں باقی رہے گا، بلکہ سیاسی ناچاقیوں کی ایک رزم گاہ بن جائے گا۔ ایسی صورت میں گھر کے نظام کا اول تو قائم رہنا ہی مشکل ہے اور اگر کسی نہ کسی طرح اس کی کوئی شکل قائم رکھی بھی گئی تو ارکانِ خاندان میں سے گھر کی زندگی سے دلچسپی کسی کو بھی نہیں ہوگی۔ میاں کسی ہوٹل میں رات گزاریں گے تو بیوی کسی کلب میں اپنی دلچسپیوں کا سامان ڈھونڈیں گی۔ صاحبزادے صاحب کسی کوٹھے پر شب بسر کریں گے اور صاحبزادی کہیں رات گزاریں گی۔ الغرض دونوں صورتوں میں اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہوگا؛ یا تو خاندان تباہ ہوگا یا ریاست۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ دونوں تباہ ہوں گے۔ چنانچہ انگلستان اور امریکہ میں خاندان تو تباہ ہو ہی چکے ہیں، اب وہاں کے اہلِ نظر اپنی حکومتوں کی تباہی کے وقت کے منتظر ہیں اور وہ وقت بھی اب کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

پانچویں دلیل :

پانچویں دلیل یہ ہے کہ عورت کی دراندازی سیاست میں بہرحال ناگزیر ہے۔ آپ اسے نمائندگی دیں یا نہ دیں وہ اپنا اثر حکومت پر ڈال کے رہتی ہے۔ اگر آپ اس کو براہِ راست دخیل ہونے کا موقع نہیں دیں گے تو وہ بالواسطہ دخیل ہوگی اور یہ بالواسطہ مداخلت لازماً غیر ذمہ دارانہ ہوگی۔ پھر کیوں نہ اس کے حق کو باضابطہ ہی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ پورے احساسِ ذمہ داری اور اعتدال کے ساتھ باضابطہ طور پر انتظامِ ملک

میں حصہ ہے!

مِل کی یہ دلیل اس کی مضبوط ترین دلیلوں میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک دلیل کی حیثیت سے اس میں کیا خوبی ہے؟ بحیثیت ایک امرِ واقعہ کے تو ہم مِل کی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ جہاں حکومت کا نظم و نسق زن مریدوں اور ہوائے نفس کے بندوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہاں سلطنت کے معاملات میں بالعموم عورتیں بڑی آسانی سے دخیل ہو جایا کرتی ہیں اور حکومت کے بڑے بڑے اہم فیصلے ان کے چشم و ابرو کے اشاروں پر ہونے لگتے ہیں اور بالآخر یہی چیز سلطنت کی تباہی کا باعث بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس سے اس بات کی معقولیت کس طرح ثابت ہوتی ہے کہ عورت کو باضابطہ حکومت میں دخیل بنا دینا چاہیے۔ ہر شہر میں آئے دن چوریاں ہوتی ہی رہتی ہیں، کیا محض اس دلیل کی بنا پر کہ یہ چوریاں تو بہرحال ہوں گی ہی، کسی حکومت کے لیے یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ وہ شہریوں کی حفاظت اور چوروں کے استیصال کے بجائے قانوناً ہر گھر کے اندر چوروں کا ایک حصہ مقرر کر دے تاکہ وہ پورے احساسِ ذمہ داری اور اعتدال کے ساتھ قفل توڑیں اور نقب لگائیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ عورت کے لیے معاملاتِ ریاست میں دخیل ہونا صحیح ہے یا نہیں؟ مِل کی مذکورہ بالا دلیل سے اس کے صحیح ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ وہ تو جس بات کو ثابت کر رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ عورت بہرحال معاملاتِ حکومت میں ٹانگ اڑائے گی ہی، اس لیے بہتر ہے کہ باقاعدہ اس کی حصہ داری تسلیم کر لو تاکہ وہ 'ذمہ داری کے احساس' اور 'اعتدال' کے ساتھ ٹانگ اڑائے۔ لیکن کوئی ہمیں یہ بتائے کہ جو مداخلت بجائے خود صحیح نہیں ہے اس کو اگر جائز اور روا تسلیم کر لیا جائے تو اس سے مداخلت کرنے والے میں اعتدال اور ذمہ داری کا احساس کہاں سے پیدا ہو جائے گا؟ کیا اس بات کی عقلی یا نقلی کوئی وجہ بھی موجود ہے کہ اگر ایک شخص کی ایک چیرہ دستی جائز

تسلیم کر لی جائے تو آئندہ وہ اپنی چیرہ دستیوں میں محتاط اور معتدل ہو جائے گا؟ انسان کی نفسیات کی شہادت تو یہ ہے کہ اگر اس کی ایک ناجائز خواہش پوری کر دی جائے تو وہ دوسری کے لیے پاؤں پھیلاتا ہے، لیکن مل صاحب ہمیں یہ منطق پڑھاتے ہیں کہ عورت کی سیاسیات میں مداخلت کو، جو جائز نہ سہی، اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر عورت جائز طریق پر مداخلت کرے گی۔ سبحان اللہ!

چھٹی دلیل:

چھٹی دلیل اشتراکی سکول کی طرف سے بڑے زور و قوت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں مساوی پیدا ہوئے ہیں اس لیے دونوں کو انتظامِ ملک میں مساوی طور پر حصہ دار ہونا چاہیے۔ مرد جو کچھ کر سکتا ہے عورت بھی وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس لیے حکومت کی ذمہ داریوں سے اس کو الگ رکھنا اس کی حق تلفی ہے۔

جہاں تک عورت و مرد کے مساوی پیدا ہونے کا تعلق ہے اس کا ایک پہلو تو بالکل صحیح ہے کہ جس طریقہ سے مرد دنیا میں آیا ہے اسی طریقہ سے عورت بھی دنیا میں آئی ہے اور جس گوشت پوست سے مرد بنا ہوا ہے اسی گوشت پوست سے عورت بھی بنی ہوئی ہے اور اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ہستی اور خلقت کے اعتبار سے حقیر و ذلیل نہیں ہے، بلکہ دونوں یکساں قدر و مرتبہ رکھتے ہیں اور نظامِ کائنات میں دونوں کی اہمیت یکساں ہے، لیکن مجرد پیدائش کی یکسانی سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ دونوں کو انتظامِ ملک کی ذمہ داریوں میں یکساں حصہ دار ہونا چاہیے۔ جو لوگ عورت کی انتظامِ مملکت میں حصہ داری کے مخالف ہیں ان کی مخالفت کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ ان کے نزدیک عورت اور مرد کی پیدائش الگ الگ طریقوں سے

ہوتی ہے یا پیدائش کے اعتبار سے ان میں سے کوئی حقیر اور فروتر ہے اور کوئی بلند و برتر۔ وہ اس کی مخالفت دونوں کی صلاحیتوں، دونوں کے فطری رجحانات اور دونوں کے جنسی میلانات کے اختلاف کی بنا پر کرتے ہیں اور یہ اختلاف ایک حقیقت ہے جس کا انکار مجرد اتنی بات سے نہیں ہو سکتا کہ دونوں کی پیدائش کے طریقہ میں ظاہری یکسانی موجود ہے۔ طریق پیدائش کی ظاہری یکسانی کے باوجود آخر عورت 'عورت ہے اور مرد 'مرد۔ دونوں کے جسم کی ساخت الگ الگ ہے۔ دونوں کے مشاغل اور دلچسپیاں الگ الگ ہیں۔ دونوں کا ارتقاء بالکل الگ الگ خطوط پر ہوتا ہے اور معاشرے میں دونوں حصہ بھی دو مختلف پہلوؤں سے لیتے ہیں۔ جب ایک ہی طرح سے دنیا میں آنے کے باوجود دونوں کے درمیان اتنے ظاہری اور باطنی اختلافات موجود ہیں اور ہم سر کی آنکھوں سے ان اختلافات کو دیکھ رہے ہیں تو مجرد پیدائش کی یکسانی کی بنا پر یہ دعویٰ کر دینا کہ عورت اور مرد دونوں انتظام ملک کی ذمہ داری میں حصہ لینے کے یکساں حقدار و سزاوار ہیں، کس قدر بعید از عقل بات ہے! رہی یہ بات کہ مرد جو کچھ کر سکتا ہے عورت بھی وہ سب کچھ کر سکتی ہے تو اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے، لیکن ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ مرد بھی وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو عورت کر سکتی ہے۔ اگر ہمارے اشتراکی دوستوں کی طرف سے یہ دعویٰ بھی کر دیا جائے کہ عورت باپ بھی بن سکتی ہے تو ہم خاموش ہو جائیں گے، اس کی تردید کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ مرد ماں بھی بن سکتا ہے۔ کیونکہ ہم عورتوں کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف نہ سہی، لیکن مردوں کے نقائص سے تو بہرحال واقف ہیں۔

یہ ہیں وہ عقلی دلائل جو مل (۱۸۰۶ء ــــ ۱۸۷۳ء) کے زمانہ سے لے کر اب تک عورت اور مرد کی سیاسی مساوات کی تائید میں پیش کیے گئے ہیں۔ ہم نے دلائل

بھی حتی الامکان صحت اور قوت کے ساتھ نقل کر دیے ہیں اور مختصراً ان پر تبصرہ کر کے ان کے ضعف و قوت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ ناظرین ان کو دیکھ کر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی دلیل بھی ایسی ہے جس کو دلیل کا نام دیا جا سکے؟

بعض بے بنیاد دعاوی:

اب اس سلسلہ میں ہم چاہتے ہیں کہ بعض بے بنیاد دعاوی کا بھی مختصراً ذکر کر دیں جن کا ہمارے ارباب کار کی طرف سے اکثر اظہار ہوتا رہتا ہے اور جن کے اندر اگرچہ فی نفسہٖ کوئی جان نہیں ہے، لیکن چونکہ وہ اکثر مجلسوں میں لیڈر صاحبان کی زبانوں سے بار بار دہرائے جاتے ہیں اس وجہ سے بہت سے سادہ لوح لوگ ان کو ایک حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔

(۱) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جب تک عورتیں زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش حصہ نہیں لیں گی اس وقت تک ملک معاشی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتا۔ اس بات کا ذکر ہمارے وزیر خزانہ، ملک غلام محمد صاحب نے کراچی کی بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس میں بھی فرمایا۔ انہوں نے اپنے اس دعویٰ کی چونکہ کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے، اس وجہ سے ہمارے لیے ان کے نقطۂ نظر کو ٹھیک ٹھیک معین کرنا اور اس کی تردید یا تائید کرنا تو مشکل ہے لیکن دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر یہ رائے معاشی نقطۂ نظر سے بھی غلط معلوم ہوتی ہے۔ ملک کی معاشی خوشحالی کے لیے بھی صحیح طریق کار یہ نہیں ہے کہ عورت بھی کارخانوں میں، ہلوں بیلوں میں، کھیتوں میں، دکانوں میں اور دفتروں میں افزائش دولت کی مہم میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لے، بلکہ معاشی نقطۂ نظر بھی یہ تقاضا کرتا ہے کہ عورت دولت کمانے کے بجائے مرد کی کمائی ہوئی دولت کو سنبھالنے اور اپنے سگھڑپن سے اس کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے کی خدمت

انجام دے۔ اگر سب کے سب افزائش دولت کی مشین ہی کے پرزے بن جائیں تو یہ تو ممکن ہے ۔۔ اگرچہ اس کا امکان بھی امکان عقلی ہی کی حد تک ہے ۔۔ کہ دولت کی پیداوار کچھ بڑھ جائے۔ لیکن اس سے اس چیز میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا جس کو خوشحالی کہتے ہیں اور جو افزائش دولت کی اصل غایت ہے۔ جس طرح افزائش دولت کی جدوجہد معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے اسی طرح اس کو سنبھالنا بھی معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ جس طرح کمانے اور پیدا کرنے سے ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح بچانے اور کفایت کے طریقے اختیار کرنے سے بھی ملک کی ثروت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح دولت کا وجود ملک اور اہل ملک کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے، شاید اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اس کا صحیح استعمال اس خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس وجہ سے عورت کے لیے معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کا صرف ایک ہی راستہ نہیں ہے کہ وہ بھی ملوں اور کارخانوں میں جا کے بھرتی ہو جائے اور کھیتوں میں جا کر ٹریکٹر چلائے بلکہ اس کا اپنے گھر کے اندر رہ کر گھر کو سگھڑپن کے ساتھ چلانا بھی ملک کی معاشی خوشحالی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا آنریبل مسٹر غلام محمد کا فرض شناسی اور دیانت و قابلیت کے ساتھ وزیر مال کے فرائض انجام دینا۔ مثال کے طور پر ایک اس خاندان کو لیجیے جس میں مرد کما کر لا رہا ہے اور عورت گھر میں راحت و آسائش کی فراہمی کا اور بچوں کو سنبھالنے کا کام کر رہی ہے اور دوسری طرف اس خاندان کو لیجیے جس میں میاں اور بیوی دونوں کمانے کے لیے چلے جاتے ہیں اور گھر میں کوئی بھی نہیں جو راحت و آسائش کا سامان کرے اور بچوں کو سنبھالے۔ کیا یہ دونوں خاندان خوشحالی میں یکساں ہوں گے؟

نیز اس صورت میں ہمارے لیے بے روزگاری کا مسئلہ پہلے سے دوگنا ہو جائے گا۔ یہاں مرد بے روزگاروں ہی کا مسئلہ مشکل ہو رہا ہے، کجا کہ عورتیں بھی روزگار مانگنے آ کھڑی ہوں۔

(۲) بعض لوگ ملکی مدافعت کے نقطۂ نظر سے بھی اس چیز کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ عورتیں ہر قسم کے فوجی فرائض انجام دینے میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہوں لیکن ہم کو یہ بات بھی بالکل غیر معقول سی معلوم ہوتی ہے۔ حفاظت ذات کے نقطۂ نظر سے عورتوں کو مدافعت کی اس حد تک تربیت تو ضرور دینی چاہیے کہ وہ شخصی و انفرادی چیرہ دستیوں سے اپنی ذات اور اپنے ناموس کو بچا سکیں اور ایسی چھوئی موئی بنی ہوئی نہ رہیں کہ آسانی سے شریروں اور پاجیوں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہو سکے لیکن ملک کی مدافعت نہ عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ نہ وہ کبھی اس کام کو کر سکی ہے اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گی۔ جس ملک کے مرد اپنے ملک کی حفاظت سے قاصر رہ جائیں گے اس ملک کی عورتیں اس کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ موجودہ زمانہ کی جنگ اس بات کا تقاضا ضرور کرتی ہے کہ عورتوں کو جنگی اسلحہ کے استعمال سے فی الجملہ آشنا کیا جائے لیکن یہ کام مردوں کی فوجی تربیت سے بالکل فارغ ہو جانے کے بعد کا ہے نہ کہ اس سے پہلے کا۔ ہمارا ملک خدا کے فضل سے ایسا ملک ہے جو بہترین فوجی نوجوان پیدا کرتا ہے، بہترین سپاہی مہیا کرتا ہے اور ایک بہترین فوجی نسل کا معدن ہے۔ اگر ہمارے تمام قابلِ جنگ نوجوانوں کی فوجی تربیت ہو جائے تو ہم اپنی ہی حفاظت نہیں بلکہ دوسروں کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تو مردوں کی تعداد کم ہے اور نہ وہ نکمے ہیں کہ ہم بہنوں اور بیٹیوں پر بوجھ ڈالیں، جو صرف ہمارے ہی اٹھانے کا ہے۔ عورتوں سے ملک کی حفاظت کا مطالبہ کرنا یا ان کی حفاظت کا بار خود ان پر ڈال دینا مردانہ ذمہ داریوں سے دست کشی کے مترادف ہے۔ ان سطروں کے لکھنے والے کو تو اس رجحان کے اندر قومی غیرت کا انحطاط نظر آتا ہے۔ یہ چیز اس ملک کے نوجوانوں کی حمیت کو سرد کر دے گی اور مردوں کے مردانہ جذبات کے نشوونما کو اس سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ قوم میں لڑنے اور مرنے کا جذبہ تو ناموس کی حفاظت

ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ جب ناموس کی حفاظت کا بوجھ خود ناموس ہی پر ڈال دیا گیا تو پھر مرد کے جینے سے کیا حاصل! اس کے بعد تو وہ زندگی کی قدر و قیمت ہی کھو بیٹھے گا۔

ایک اور پہلو سے بھی یہ مسئلہ قابلِ غور ہے۔ ہمارے حالات ہمارے پڑوسی ملک بھارت سے کس پہلو سے اتنے مختلف ہیں کہ ہم اپنے ملکی تحفظ کے لیے عورتوں کی مدد کے محتاج ہو گئے ہیں اور وہ اس کا محتاج نہیں ہوا ہے؟ کیا ہمارے پاس نوجوانوں اور قابلِ جنگ مردوں کی کمی ہے اور اس کے پاس کمی نہیں ہے؟ ابھی پچھلے دنوں بھارت کے کمانڈر انچیف، جنرل کریاپا نے امرتسر میں ایک تقریر کرتے ہوئے عورتوں کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے:

> "دیویو! تم گھر کے کام کاج سنبھالو، فوج کے کاموں میں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کے لیے مردوں کی کمی نہیں ہے"

صرف یہی نہیں، بلکہ فوج میں عورتوں کی ملازمت سے متعلق حکومتِ ہند نے ایک ہنگامی قانون نافذ کر دیا ہے جس میں عورتوں کو فوج میں ملازمت سے روک دیا گیا ہے[1]۔

گورنر جنرل بھارت نے آرمڈ فورسز (سیلینس پریویژنز) آرڈیننس ۱۹۵۰ء کے نام سے ایک ہنگامی قانون جاری کیا ہے۔ اس قانون کے ذریعہ سے فوج میں عورتوں کی ملازمت اور فوجیوں کی ٹریڈ یونینوں میں شرکت پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ فوج میں عورتوں کی ملازمت کے بارہ میں اس قانون میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی عورت کو فوج میں نہیں لیا جائے گا الا یہ کہ مرکزی حکومت سرکاری گزٹ کے ذریعہ کسی برانچ یا کور کے لیے بطور خاص اجازت دے[2]۔

علاوہ ازیں بھارتی فوج کی بارکوں اور ان کے کھانے کے کمروں میں اب بنی ٹھنی

---

[1] "دہلی"، ۲۵، جنوری ۱۹۵۰ء (ریٹ۔ پی۔ پی)

[2] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور: ۲۹ جنوری ۱۹۵۰ء

لڑکیوں (PIN-UP GIRLS) کا داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ ہندوستانی فوج کے سپہ سالار، جنرل کریاپا نے خود اپنے دستخطوں کے ساتھ یہ اعلان جاری کیا ہے کہ نچنی لڑکیوں کے مظاہروں کی اب اجازت نہیں ہوگی[1]۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے اور ہمارے پڑوسیوں کے رجحان میں اس معاملہ میں اتنا اختلاف کیوں ہے ؟ کیا اس لیے کہ ہم عورتوں کے بغیر اپنے ملک کا تحفظ نہیں کر سکتے اور وہ کر سکتے ہیں ؟ یا اس لیے کہ ہماری اسلامی حکومت کی فوج عورتوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے اور اُن کی فوج ہو سکتی ہے ؟

(۳) بعض حضرات یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عورت اور مرد، دونوں ہر شعبۂ زندگی میں دوش بدوش کام کریں، ورنہ ملک کے اندر انتشار رہے گا اور اس انتشار سے دشمن فائدہ اٹھائے گا۔

اب تک تو ہم انتشار اس چیز کو سمجھتے تھے کہ دو مختلف عناصر اپنی قدرتی حد بندیوں اور فطری تقسیم عمل کو توڑ کر ایک دوسرے کے حدود میں گھسنے اور باہم دگر ایک دوسرے سے ٹکرانے کی کوشش کریں۔ لیکن مذکورہ بالا ارشاد سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ انتشار یہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو ہم آہنگی اور سازگاری ہے۔ انتشار یہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے حلقہ میں اپنے فطری فرائض پر قانع رہیں اور ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے آستینیں چڑھانے اور خم ٹھونک کر میدانِ مقابلہ میں آنے کے بجائے صرف اپنے اپنے کاموں میں لگے رہیں۔ یہ حالت ان حضرات کے نزدیک ملک کے لیے خطرہ ہے اور دشمن اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ سازگاری اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا نسخہ ان لوگوں کے نزدیک گویا یہ

---

[1] اسلامک لائٹ۔ کراچی : دسمبر ۱۹۴۹ء - جنوری ۱۹۵۰ء

ہے کہ عورت کو اس کی گھر گرہستی کی موجودہ ذمہ داریوں سے آزاد کر کے اس کا موقع دیا جائے کہ وہ ہر کارخانہ اور ہر کمپنی، ہر شعبہ اور ہر دفتر، ہر کالج اور ہر سکول، ہر ملازمت اور ہر پیشہ میں مرد کا مقابلہ کرے اور مرد صاحب کو مجبور کرے کہ ذرا زچہ خانہ اور باورچی خانہ کی ذمہ داریوں کے مزے وہ بھی چکھ لیں۔ اس کے بعد ان حضرات کے نزدیک اجتماعی زندگی میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی کہ کیا مجال جو کوئی دشمن قیامت تک اس ملک کو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھ سکے۔

(۴) بعض کام ایسے ہیں جن کو یورپ کی قوموں نے عورتوں کے لیے مخصوص سا کر دیا ہے، مثلاً ٹائپسٹ کا کام، ٹیلیفون ایکسچینج کا کام یا نرسنگ کا کام وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ ان کاموں کے عورتوں کے لیے مخصوص ہونے کی کوئی عقلی یا نقلی وجہ موجود نہیں ہے، لیکن جو حضرات معاملہ کو حضرت "صاحب" کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں، وہ خود اپنی فکر و نظر سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کے نزدیک ان کاموں کا عورتوں کے لیے مخصوص ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ کام عورتوں ہی کے لیے بنے ہیں اور وہی اس کو انجام دے سکتی ہیں اور اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ حالانکہ یورپ اور امریکہ میں اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے یہاں اس بات کے لیے کوئی وحی اتری ہوئی ہے کہ یہ کام عورتوں ہی کے لیے خاص ہیں یا سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ کام بس عورتیں ہی کر سکتی ہیں، مردوں کی صنف اس کی انجام دہی سے قاصر ہے، یا تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ عورتیں ان کاموں کے لیے مردوں سے بہتر ہیں۔ بلکہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب انہوں نے مساوات مرد و زن کے نظریہ کے مطابق زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کو لا داخل کیا تو عورتیں بہت سے کاموں کے لیے اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے ناموزوں ثابت ہوئیں اس لیے ان ہلکے کاموں کو ان کے لیے خاص کر دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنے مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کی وجہ سے انہوں نے یہ چاہا کہ ہر دفتر اور ہر ہسپتال میں مردوں کا جی بہلانے کے لیے عورتوں کا بھی سامان کردیں۔ ہم نہ تو مساواتِ مردوزن کے اس نظریہ ہی کو صحیح سمجھتے اور نہ صاحب لوگوں کے اس اخلاقی نقطۂ نظر ہی کے قائل ہیں کہ مردوں کا جی بہلانے کے لیے ہر جگہ عورت کا ہونا ضروری ہے۔ اس وجہ سے کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کر ان کی بیہودہ روش کی تقلید کریں۔

لطف یہ ہے کہ جو حضرات ان کاموں کے لیے عورتوں کو ناگزیر قرار دیتے ہیں وہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ مرد ان کاموں کو بہت اچھی طرح کرسکتے ہیں اور انہوں نے ان کو بہت خوبی کے ساتھ انجام دیا بھی ہے۔ مثال کے طور پر نرسنگ کو لیجیے۔ اس کے متعلق ۱۷ فروری ۱۹۵۰ء کو میو ہسپتال میں، ٹرینڈ نرسز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے بیگم سلمیٰ تصدق حسین صاحبہ نے ایک پر زور تقریر فرمائی جس میں انہوں نے ہر پہلو سے اس پیشہ کے لیے لڑکیوں کو راغب کیا اور اس کے لیے انہیں تمام "بوسیدہ بندشوں" کو توڑ کر پھینک دینے تک کا مشورہ بھی دیا لیکن دورانِ تقریر میں یہ بھی فرمائیں:

"گزشتہ جنگِ عظیم میں نرسوں کی روز افزوں ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مردوں کی بہت بڑی تعداد بھرتی کی گئی اور یہ سکیم کامیاب ثابت ہوئی۔ جنگ کے بعد ان مردوں (MALE NURSES) کو رخصت کر دیا گیا۔ فوج میں اب بھی مردوں سے تیمارداری (NURSING) کا کام لیا جا رہا ہے"[1]

سوال یہ ہے کہ جب مرد اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں اور اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے اور ملک میں ایک بڑی تعداد تربیت یافتہ تیماردار مردوں کی موجود بھی ہے جو غالباً

---

[1] ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور: ۱۸، فروری ۱۹۵۰ء

بیکار ہی ہوں گی اور ان میں سے ایک کو کام میں لگانے کے معنی ایک پورے کنبہ کی پرورش کے ہیں تو لڑکیوں کو گھروں سے نکلنے، انہیں غیر شادی شدہ زندگی بسر کرنے اور ایسی حالت میں غیر محرموں کی تیمار داری کے کام میں لگانے پر مجبور کرنے کے کیا معنی؟ کیا جراثیم کی غذا اور فطرت سے جنگ کر کے اس راہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کی محض فلارنس نائٹنگیل کے مقدس عہد نامہ کے الفاظ اس کی محافظت کر سکیں گے!

معاشی اور سیاسی سرگرمیوں میں عورتوں کے مردوں کے دوش بدوش حصہ لینے کی تائید میں دلیل یا دعویٰ کی صورت میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ یہ ہے جو ہم نے ناظرین کے سامنے رکھ دیا ہے اور ہر دعویٰ اور دلیل کی حقیقت بھی واضح کر دی ہے۔ ناظرین ان دعاوی و دلائل کے ضعف و قوت کا خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بحث ناتمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ عورت کی سیاسی و معاشی سرگرمیوں کے مضر پہلوؤں کو بھی وضاحت کے ساتھ نہ بیان کر دیں۔ چنانچہ اگلا باب ہم اسی بحث کے لیے خاص کریں گے۔

باب ۶

عورت کی معاشی اور سیاسی مصروفیتوں کے مضر پہلو

پچھلے باب میں آپ نے دیکھ لیا کہ جو لوگ عورتوں کو انتظامِ حکومت اور دوسری سرگرمیوں میں مردوں کے برابر کر دینے کے حامی ہیں ان کی کوئی دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس کو دلیل کا نام دیا جا سکے۔ لیکن مجرد یہ بات کہ ایک چیز کو دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بات کو مدعی دلیل سے ثابت نہ کر سکے لیکن فی نفسہ وہ صحیح ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو اگر ثابت کرنے کی کوشش کیجیے تو اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ملتی یا کم از کم کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جو مسکت ہو اور مخاطب کو قائل کر سکے، لیکن تجربہ سے وہ باتیں صحیح اور مفید ثابت ہوتی ہیں یا کم از کم ان کو غلط اور مضر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس وجہ سے تنہا یہ بات کہ جل اور آزادیٔ نسواں کے دوسرے علم برداروں کی کسی دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے، عورت کے مقدمہ کو خارج کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم کو اس کے مضر پہلوؤں پر بھی، اگر اس کے کچھ مضر پہلو موجود ہیں، روشنی ڈالنی چاہیے۔ اگر بے دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک چیز کا تمدنی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے مضر ہونا بھی ثابت ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ فی الواقع وہ چیز غلط ہے اور جو لوگ اس کی وکالت کر رہے ہیں وہ نہ صرف ایک بے دلیل دعویٰ کی وکالت کر رہے ہیں بلکہ وہ ملک کے اندر ایک ایسے ہیجان کو ہوا دے رہے ہیں جو ہمارے نظامِ اجتماعی کو درہم برہم کرنے والا ہے۔

اس پہلو سے ہم نے عورتوں کے مسئلہ پر جس قدر غور کیا ہے اس سے ہم اس نتیجہ

پر پہنچے ہیں کہ مساواتِ مرد و زن کے نظریہ کی اساس پر عورت کو انتظامِ حکومت اور معاشی جھمیلوں میں ڈالنا اپنے اندر مضرت کے گوناگوں پہلو رکھتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس کا مضر اثر خود عورت کی ذات اور اس کی خلقی صفات پر مترتب ہوتا ہے، پھر آگے چل کر خاندان اور معاشرہ اس کی مضرتوں سے نہایت بری طرح متاثر ہوتے ہیں اور آخر میں خود ریاست اس کے نقصانات کا شکار ہوتی ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کے مہلک نتائج کی لپیٹ میں فرد، سماج اور سٹیٹ تینوں بیک وقت آتے ہیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ یہ ایک غلطی کر گزرنے کے بعد کسی قوم کو اپنی تباہی کے لیے کسی مزید غلطی کے ارتکاب کی ضرورت نہیں ہے۔ تنہا یہی ایک غلطی اس کے سارے نظام کا تیا پانچا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

نقصانات جو خود عورت کو پہنچتے ہیں:

عورت کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے معاشی اور سیاسی جھمیلوں میں پڑنے کے لیے نہیں بنایا ہے۔ بلکہ خاندان اور گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کے لیے بنایا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنی اصل جگہ چھوڑ کر معاش اور سیاست کے جھگڑوں میں پڑتی ہے تو اس کو روحانی اور مادی دونوں قسم کے گوناگوں نقصانات پہنچتے ہیں، جو ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کھلے ہوئے نقصانات یہ ہیں:

(۱) حصولِ معاش اور سیاست کے میدان میں جب عورت اترتی ہے تو اس کو ایک ایسے حریف سے ــ مرد سے ــ سابقہ پیش آتا ہے جو اس میدان کی بازیاں جیتنے کے لیے اس پر خلقی اور فطری برتری رکھتا ہے۔ اس میدان میں مرد کی قوتیں اور قابلیتیں ٹھیک اسی طرح اس کے ساتھ سازگاری اور تعاون کرتی ہیں جس طرح ایک مگرمچھ کی فطری صلاحیتیں سمندر کے اندر اس کے ساتھ سازگاری کرتی ہیں۔ اس کے برعکس عورت کی

فطری قابلیتیں اس میدان میں اس کا ساتھ دینے کے بجائے الٹے اس کے حوصلوں سے مزاحمت شروع کر دیتی ہیں. جس کے سبب سے وہ اپنے آپ کو بالکل اس پوزیشن میں پاتی ہیں جس پوزیشن میں ایک خشکی کا جانور، اپنے آپ کو پانی میں یا پانی کا جانور خشکی میں پاتا ہے. اس مقابلہ میں مرد کی یہ برتری اکتسابی (ACQUIRED) نہیں بلکہ خلقی اور فطری (INHERENT) ہوتی ہے. اس وجہ سے عورت انتہائی جدوجہد کے باوجود بھی اپنے نقص کی تلافی کی کوئی راہ نہیں پاتی. جس کا لازمی نتیجہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ عورت اپنی بے بسی تسلیم کر کے بالآخر مرد کی ایک تابع مہمل بن کے رہ جاتی ہے اور اپنی شخصیت مرد کی شخصیت میں بالکل گم کر دیتی یا یہ ہوتا ہے کہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر وہ ہر بات میں مرد کی ریس کرنے اور اس کی نقل اڑانے لگ جاتی ہے. ان دونوں حالتوں میں سے عورت کی کوئی حالت بھی قابل رشک نہیں ہے. پہلی صورت میں وہ اپنی صلاحیتوں کی طرف سے مستقل مایوسی میں مبتلا ہو جاتی ہے، جو اس کی شخصیت کی ترقی کو بالکل ختم کر دینے والی چیز ہے اور دوسری صورت میں وہ خود بھی محسوس کرتی ہے اور دوسرے بھی اس چیز کو محسوس کرتے ہیں کہ اس نے جو جامہ پہن رکھا ہے یہ اس کا اپنا جامہ نہیں ہے بلکہ مستعار جامہ ہے، جو مرد سے حاصل کیا گیا ہے.

(ب) اس مقابلہ میں پڑنے کے بعد عورت اپنے بہت سے اعلیٰ اوصاف کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوتی ہے اور ان کی جگہ پر اپنے اندر دوسرے اوصاف پیدا کرتی ہے جو کسی طرح اس کے اصلی اوصاف کے قائم مقام نہیں ہو سکتے. وہ دنیا میں جنم دینے والی اور پالنے والی بنا کر بھیجی گئی ہے، لیکن اس نئے شوق میں مبتلا ہو کر اسے تباہ کرنے والی اور ہلاک کرنے والی بننا پڑتا ہے. اللہ تعالیٰ نے اسے سنبھالنے والی، نگہداشت کرنے والی اور فیض پہنچانے والی بنایا ہے. لیکن اس مقابلہ میں پڑ کر اسے مطالبہ کرنے سے لے کر ہڑتال اور سٹرائیک، تخریب اور انقلاب پیدا کرنے کے

سارے ہنگاموں میں حصّہ لینا پڑتا ہے۔ قدرت نے اُسے مامتا کا جمال اور زوجیت کی محبوبیت اور سکینت بخشی ہے، لیکن سیاست اور معاش کا روگ جب اسے چمٹ جاتا ہے تو وہ ایک جوڑ توڑ کرنے والی اور بحث و مباحثہ کرنے والی کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی۔ اس کی مادرانہ شفقت کا تبسّم اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ قیمتی اور حیات بخش دولت ہے، لیکن اس میدان میں قدم رکھنے کے بعد وہ مجبور ہوتی ہے کہ اس مادرانہ تبسّم کو مدبّرانہ عبوست اور لیڈرانہ زہرخند سے بدلے۔ بحیثیت ایک بیوی کے اس کی معیّت و رفاقت، ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں، اس دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہے، لیکن اس نئے مشغلہ کے بعد ایک بیوی سے زیادہ وہ اپنے اندر ایک حریف اور مدِّمقابل کی خصوصیات جمع کر لیتی ہے۔ ان دونوں متقابل اوصاف کا موازنہ کر کے دیکھیے کہ دوسرے کے نفع و نقصان سے قطعِ نظر خود عورت اپنی ذات کے نقطۂ نظر سے یہ نفع کا سودا کرتی ہے یا خسارہ کا؟

(ج) ایک عورت اپنے فطری منصب کے لحاظ سے اپنے گھر کی حکمران ہے، اپنے شوہر کی عزت اور اس کی دولت میں اس کی شریک و سہیم ہے۔ اس کے تمام ذاتی اختیارات و تصرّفات میں اس کا دستِ راست ہے، اولاد کی کمائی اور ان کی ساری قوت و طاقت کی خزانہ دار ہے اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کی اس سلطنت میں اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکے۔ شوہر کو اگر اس دائرہ کے اندر کوئی مداخلت کا حق ہے بھی تو اس کی حیثیت ایک رسمی اور قانونی حق سے زیادہ نہیں ہے۔ میاں اور بیوی کی سازگاری کی شکل میں کوئی شوہر بھی کبھی معاملاتِ خانگی میں نہ ٹانگ اڑانے کی جرأت کرتا ہے اور نہ وہ اس کا شوقین ہی ہوتا ہے۔ یہ سلطنت ہر عورت کو بلا کسی مطالبہ اور بغیر کسی کشمکش کے حاصل ہوتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ عورت اگر اس سلطنت کو چھوڑ کر معاشی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کے لیے باہر نکلتی ہے تو وہ اس کے بدلہ میں

کیا حاصل کرتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ کسی کارخانہ یا دفتر کے اندر ایک ملازمت یا حکومت کے اندر ایک کرسی جس کا بڑے سے بڑا فائدہ اگر ہو سکتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ عورت کو معاشی خود مختاری حاصل ہو جائے۔ کیا یہ معاشی خود مختاری ایسی چیز ہے جس کے لیے عورت اپنے گھر کی مملکت کو خیرباد کہہ دے؟ اور کیا وہ ایسا کر کے فی الواقع کوئی نفع کا سودا کرتی ہے؟ یہ خوب ملحوظِ خاطر رہے کہ گھر کی مملکت خود اپنی ذمہ داریاں اور اپنی مصروفیتیں رکھتی ہے اور عورت کو اس کے اندر جو اقتدار حاصل ہوتا ہے وہ اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ ان کے اندر اپنے آپ کو کھپاتی ہے۔ اگر وہ گھر کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو کر کسی دفتر یا کارخانہ میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کر دے تو اس گھر کے اندر اس کا اقتدار محض اس بنیاد پر قائم نہیں رہے گا کہ وہ گھر کے مالک کی بیوی ہے یا گھر کے مالک کی اولاد اس کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ محض یہ حقیر حیوانی رابطہ اس روحانی و اخلاقی اور مادی سلطنت کے قیام کے لیے کافی نہیں ہے جس کو گھر کہتے ہیں۔

(د) سیاست اور معیشت کے میدان میں عورت خواہ کتنی ہی سر مارے اول تو اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے وہ اپنی بہت سی اعلیٰ خصوصیات کو تباہ کرنے کے بعد بھی مرد کے مقابل میں فروتر ہی رہتی ہے، ثانیاً اس میدان میں اگر وہ کوئی خدمت انجام دیتی بھی ہے تو مرد کی طرف سے مشکل ہی سے اس کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ بظاہر تو عورت کو بڑے چاؤ اور پیار سے سیاسی اور معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے تعاون کے بغیر سیاست کے سارے عقدے بھی ناکشودہ ہیں اور معیشت کی ساری راہیں بھی بند ہیں، لیکن فی الواقع اس میدان میں نہ عورت کی قابلیت سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اس کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ پارلیمنٹ کے ایوان کے اندر بھی عورت کو ایک مدبر اور قانون دان کی حیثیت سے دیکھنے اور اس کے تدبر اور اس کی معاملہ فہمی کی داد دینے کے بجائے اس کے دوپٹہ کی شکنوں اور اس

کی سازش ہی کے رنگوں ہی کو دیکھتا ہے اور اگر کوئی داد دیتا ہے تو اسی پہلو سے دیتا ہے۔
اس کے ثبوت کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے خود اپنے ہی ملک کی پارلیمنٹ کی رودادیں، جو اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں، اگر ملاحظہ سے گزری ہوں تو اس کی بہت سی شہادتیں آپ کو مل جائیں گی۔ ایک تازہ شہادت ملاحظہ ہو۔ ڈیلی 'ڈان' کراچی کا نامہ نگار پاکستان پارلیمنٹ کے ۱۹۵۰ء کے بجٹ سیشن کا ذکر کرتے ہوئے ۱۲ مارچ ۱۹۵۰ء کے 'ڈان' میں اپنے تأثرات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بیگم اکرام اللہ اور بیگم شاہنواز نے جو ہمیشہ خوش پوش (WELL-DRESSED) رہتی ہیں کل اپنے لباسوں کے رنگوں کے انتخاب سے بہت متأثر کیا۔ بیگم اکرام اللہ کے لباس کا ہلکا کریم اور بیگم شاہنواز کے لباس کا ہلکا آسمانی رنگ بھیگے بھیگے موسم (MOIST WEATHER) سے خوب مناسبت رکھتا تھا۔"

سوال یہ ہے کہ اگر نسوانیت کی بہت سی خوبیاں برباد کرنے کے بعد بھی عورت مرد سے اپنی سیاسی برتری تسلیم نہ کرا سکی یا کم از کم اس پہلو سے اپنی اہمیت اور ضرورت ہی مرد پر ثابت نہ کر سکی بلکہ یہاں بھی اگر کچھ کام آئی تو اس کی نسوانیت ہی کام آئی تو اس سیاست کے پاپڑ بیلنے سے عورت کو فائدہ ہوا یا نقصان؟

اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود یورپ، امریکہ، اور روس اور مساواتِ مرد و زن کے تمام مدعی ممالک میں سیاست و معیشت آج بھی صریح طور پر مرد ہی کے انگوٹھے کے نیچے ہے، اور عورت کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں بن سکی ہے کہ وہ ایک ایسی اسسٹنٹ ہے جس کی خدمات اس لیے حاصل نہیں کی گئی ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چل رہا تھا، بلکہ صرف اس لیے کہ یہاں آکر ذرا مرد کا دل بہلائے۔

نقصانات جو خاندان اور معاشرہ کو پہنچتے ہیں:

یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ تمام نظامِ اجتماعی و سیاسی کے اندر اصلی مرکزی

نقطہ خاندان ہے۔ پہلے خاندان وجود میں آتا ہے۔ پھر خاندان کے مجموعہ سے معاشرہ بنتا ہے اور پھر معاشرہ سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ اگر خاندان کا وجود نہ ہوگا تو ریاست وجود میں نہیں آسکتی۔ اگر خاندان کے نظام میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس کے اثر سے ریاست کے نظام میں خلل واقع ہو جائے گا اور اگر خاندان کا شیرازہ منتشر ہو جائے تو پوری ریاست کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ خاندان کی اس اہمیت کی وجہ سے نظامِ اجتماعی وسیاسی کے اندر سب سے زیادہ فکر اسی کے تحفظ کی کی جاتی ہے کیونکہ اُس کی حیثیت جڑ کی ہے اور اُسی کے تحفظ پر پورے نظام کے تحفظ کا انحصار ہے۔

خاندان کی اس اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب آیئے دیکھیے کہ خاندان کی شیرازہ بندی میں اصل اہمیت کس کو حاصل ہے، مرد کو یا عورت کو؟

اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاندان کی تشکیل میں مرد اور عورت دونوں ہی حصہ لیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کام میں جو حصہ عورت کا ہے وہ حصہ مرد کا نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ سامانِ تعمیر کی فراہمی میں تو بے شک مرد کا حصہ نمایاں ہے، لیکن گھر کی اصلی معمار عورت ہی بنتی ہے۔ اسی کی ذات کی کشش ہے جس کی شیرازہ بندی سے گھر، گھر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ وہ نہ ہو تو گھر کے ساتھ مرد کی وابستگی آدھی بھی باقی نہ رہے، گھر والوں کو دو وقت کی روٹی ملنی بھی دشوار ہو جائے، بچے سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرنے لگیں اور دیکھتے دیکھتے نوکر اور نوکرانیاں گھر کو ٹھکانے لگا دیں۔ عورت موجود ہے تو سارا چمن آباد ہے اور اگر وہ غائب ہو جائے یا ذرا سی غافل ہی ہو جائے تو تھوڑی دیر بھی نہ گزرے کہ ہر طرف خاک اڑنے لگے۔

گھر کی ظاہری صورت پذیری ہی عورت کی رہینِ احسان نہیں ہے، بلکہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ گھر کی معنوی اور روحانی صورت گری میں بھی جو حصہ عورت کا ہے وہ

حصہ مرد کا نہیں ہے۔ اس کے رحم کی طہارت سے خاندان میں نجابت و شرافت کا جوہر پیدا ہوتا ہے، اس کی مامتا کا جمال گھر کو رحم و محبت کی نورانیت سے منور کرتا ہے، رفیق زندگی کی حیثیت سے اسی کی وفاداریاں اور جاں نثاریاں ہیں جو خاندان میں وفاداریوں اور جاں نثاریوں کی روایات چھوڑتی ہیں۔ اُس کے صبر و وفا سے بچے صبر و وفا کا سبق سیکھتے ہیں۔ اُسی کی قربانیوں سے اولاد کو ایثار کا درس ملتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی ایک گردش میں جو معانی مضمر ہوتے ہیں وہ ہزارہا اوراق میں نہیں سما سکتے اور وہ اپنی پر محبت جھڑکیوں سے جو کچھ سکھا دیتی ہے ہزارہا معلموں کی محنت سے بھی وہ چیز نہیں سکھائی جا سکتی۔

یہ ساری برکتیں خاندان کو صرف عورت کی بدولت حاصل ہوتی ہیں۔ اگر عورت کو اس کی جگہ سے ہٹا کے کسی کارخانہ یا دفتر میں بھیج دیجیے تو خاندان کے اندر اس کے سبب سے جو جگہ خالی ہو گی اس کو آپ کسی اور طرح سے نہیں پُر کر سکتے۔ دفتروں اور کارخانوں کے لیے آپ کو ہر ساخت اور ہر قابلیت کے لاکھوں اور کروڑوں آدمی مل سکیں گے، لیکن گھر کے اندر جو جگہ وہ خالی کرے گی اس کو بھرنے کے لیے اس آسمان کے نیچے اُس کے سوا خدا نے کسی اور کو پیدا ہی نہیں کیا ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں ہے کہ روٹی ہوٹلوں میں بھی کھائی جا سکتی ہے، راتیں کلبوں اور سینما گھروں میں بھی گزاری جا سکتی ہیں، خبر گیری و تیمارداری ہسپتال اور نرسنگ ہوم میں بھی مل جاتی ہے، علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ انعامات اور تمغوں کا لالچ دلا کر ۔ جیسا کہ روس میں کیا جاتا ہے ۔ عورتوں سے بچے بھی جنوا لیے جایا کریں اور سرکاری پرورش گاہوں میں کرایہ کی نرسوں اور اتاؤں کے ذریعہ سے ان بچوں کی پرورش بھی کرا لی جایا کرے، لیکن اس کو خوب یاد رکھیے کہ ہوٹل میں جینے اور ہسپتال میں مرنے کی یہ زندگی نہ تو خاندان کی زندگی کا بدل ہو سکتی اور نہ تمغہ اور الاؤنس کی خاطر جنے ہوئے بچوں اور

سرکاری پرورش گاہوں میں کرایہ پر اگائی ہوئی اور پرورش پائی ہوئی نسلوں سے کوئی قوم بن سکتی ہے۔ آدمی سازی اور جوتا سازی کے کام میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ آپ جس طرح انعام اور اجرت کے بل پر کارخانوں میں جوتے تیار کرا سکتے ہیں، اگر وہی طریقہ آپ نے آدمی سازی کے لیے بھی اختیار کر لیا تو آدمیوں کی شکل کی ایک مخلوق تو ضرور تیار ہو جائے گی، لیکن وہ آدمیت کے تمام اوصاف سے یکسر خالی ہوگی۔ جو آدمی بالکل جوتوں کی طرح تیار کیے جائیں گے وہ پاؤں میں پامال کیے جانے کے لیے تو اچھے رہیں گے، لیکن زمین کی خلافت میں ان کا کوئی حصّہ ہو، یہ ناممکن ہے۔

جو بچے اس طرح دنیا میں آئیں گے کہ وہ اپنے باپ کو بھی متعین طور پر شناخت نہ کر سکیں، وہ نجابت و شرافت کا جوہر کہاں سے لائیں گے؟ جو ماں کی مامتا اور اس کی شفقت سے کبھی آشنا ہی نہ ہوئے ہوں، ان کے اندر رحم و شفقت کے جذبات کس طرح نشو و نما پائیں گے؟ جو حقیقی بھائیوں اور بہنوں کی طرح ایک ماں باپ کی آغوش میں پلے ہی نہ گئے ہوں، وہ خونی اخوت و حمیت کے رموز سے کہاں سے آشنا ہوں گے؟ جنہوں نے ایک خاندان کے اندر رہ کر ایک وفادار اور جاں نثار ماں اور ایک وفادار اور شفیق باپ کی زندگی دیکھی ہی نہ ہو، وہ وفاداری اور جاں نثاری کے مفہوم سے کس طرح واقف ہوں گے؟ جنہوں نے ماں اور باپ کے ایثار کے مزے سرے سے اٹھائے ہی نہ ہوں وہ دوسروں کے لیے کس طرح ایثار کر سکیں گے؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خاندان کے نظام کو منتشر کر دینے کے بعد ان اوصاف کی پرورش کے لیے کوئی اور طریقہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو یاد رکھیے کہ یہ محال ہے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان جذبات و عواطف کے بغیر بھی اس کا یہ کارخانہ چل سکتا ہے تو یہ محال تر ہے۔ آج دنیا میں جو خرابیاں پھوٹ پڑی ہیں اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ انسان ان اوصاف سے خالی ہو رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ ان اوصاف سے بالکل ہی خالی ہو گیا تب تو اس دنیا کا ایک گھڑی بھی باقی رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ جو تباہی اس پر صبح کو آنی ہے وہ شام ہی

اگرچہ یہ باتیں بالکل واضح ہیں لیکن بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر خاندان کے ساتھ عورت کی وابستگی اس درجہ ضروری ہے کہ اس کے اس مقام سے ہٹتے ہی سارے نظام اجتماعی وسیاسی کے انتشار کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے تو آخر یورپ و امریکہ اور روس جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں نے اس خطرہ کو کیوں نہیں محسوس کیا اور انہوں نے عورت کو گھر کی پابندیوں سے آزاد کر کے سیاست و معیشت کی تمام سرگرمیوں میں کس طرح مرد کے برابر لا کھڑا کیا اور اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان ملکوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی انتشار نہیں پیدا ہو رہا ہے، بلکہ یہ برابر ترقی کر رہے ہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے میں یہاں روس اور امریکہ میں خاندان کے نظام کا جو حال ہے اور اس کے سبب سے وہاں کے اہل نظر جو کچھ محسوس کر رہے ہیں، اس کو پیش کر دوں گا تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ یہاں سے بیٹھے ہوئے ہم اُن کی حالت کو جس درجہ قابل رشک پا رہے ہیں اور اُن کی تقلید کے لیے بے قرار ہیں وہ خود اپنی حالت کو اس قدر قابل رشک نہیں پا رہے ہیں بلکہ اپنے خاندانی نظام کے انتشار کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سخت خطرہ میں گھرا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔

روس کے تجربات:

پہلے سویت روس کو لیجیے اور یہ دیکھیے کہ بیس سال کے اندر اندر انہوں نے اپنے خاندان کے نظام پر کیا کیا تجربے کیے، ان تجربات کے کیا نتیجے ان کے سامنے آئے اور اب وہ کس مقام پر ہیں؟

اشتراکی فلسفہ کی رو سے انسانی زندگی میں جس چیز کو اصل اہمیت حاصل ہے وہ معیشت کا نظام ہے۔ معاشی نظام ہی ہے جو ان کے نزدیک مذہب، اخلاق، قانون اور تہذیب و تمدن کو جنم دیتا ہے اور سوسائٹی کی ترکیب اور اس کی شکل و صورت متعین کرتا ہے۔ چنانچہ اشتراکی منشور میں یہ قرار دیا گیا کہ بورژوائی نظام خاندان بھی سرمایہ

اور شخصی مفاد کی پیداوار ہے اس لیے اشتراکی نظام جس طرح سرمایہ کو ختم کر دے گا اسی طرح اس بورژوائی نظامِ خاندان کو بھی ختم کر دے گا۔ اینجلز نے اپنی کتاب 'خاندان کا آغاز' میں لکھا ہے کہ خاندان دراصل اس اقتصادی نظام کا نتیجہ ہے جو ملکِ ذاتی کے نظریہ پر قائم ہے اور جو ایک نسل کو دوسری نسل سے وراثت پانے کا حق دیتا ہے، جس میں شوہر بیوی پر اس لیے تحکم جتاتا ہے کہ وہ تنخواہ وصول کر کے لاتا ہے۔ اینجلز نے اپنے اس نظریہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر حقِ وراثت اور ملکِ ذاتی کو اڑا دیا جائے اور عورت کو معاشی حیثیت سے مرد کے برابر کر دیا جائے تو پھر خاندانی نظام اور گھر کو قائم رکھنے کی کوئی اقتصادی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ رہا بچوں کی پیدائش اور ان کی پرورش کا معاملہ تو اس کو اینجلز نے یوں حل کیا کہ عورت اور مرد کے ملاپ سے جو بچے پیدا ہوں، ان کی پرورش اور تربیت کا انتظام ریاست کرے۔ اپنی اس کتاب میں اینجلز نے عورت اور مرد کے درمیان تعلق کا واحد محرک شہوت اور جنسی جذبات کو قرار دیتے ہوئے یہ فلسفہ ایجاد کیا کہ عورت اور مرد کے درمیان وہی تعلق جائز ہے جو شہوت اور جنسی جذبات پر مبنی ہو اور اسی وقت تک جائز ہے جب تک یہ جذبات اس تعلق کے مقتضی ہوں۔ جب یہ جذبات سرد پڑ جائیں یا ان پر کوئی دوسرا جذبہ غالب آ جائے تو دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔

اسی فلسفہ پر اشتراکیوں نے روس میں اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی تعمیر شروع کی۔ اس نقطۂ نظر کو جمعیتِ اقوام میں سوویت روس کی نمائندہ 'مادام کولنتائی' نے نہایت خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں پیش کیا کہ "محبت ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس ہے جو آدمی پیاس بجھانے کے لیے پیتا ہے۔ آپ پانی پی لیتے ہیں، گلاس کو بھول جاتے ہیں، اسی طرح (عورت و مرد کے باہمی ملاپ سے) آپ لطف اٹھا لیتے ہیں اور جس سے لطف اٹھاتے ہیں اس کو بھول جاتے ہیں":

اس نظریہ پر معاشرے کی تشکیل کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر اشتراکی روس کے قوانین ازدواج ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۷ء میں دو باتیں بالکل واضح طور پر طے کر دی گئیں:

ایک یہ کہ تمام بچے ریاست کی ملک ہوں گے۔

دوسری یہ کہ مذہب کے تحت باندھے ہوئے تمام نکاح ناجائز قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کو ختم کرنے کے لیے ایک فریق کا دوسرے کو اپنے ارادہ سے محض ایک کارڈ کے ذریعہ سے اطلاع کر دینا کافی ہوگا۔

خاندانی نظام اور گھر بنا کر رہنے کے خلاف جذبات کو یہاں تک مشتعل کیا گیا کہ اشتراکی پارٹی کی تیرھویں کانگریس نے گھر (FAMILY) کو سابق نظام سرمایہ داری کے ہتھکنڈوں کا مرکز اور اس کی کینہ حرکات کی آخری کمین گاہ قرار دیا۔

گھر کو تباہ کرنے کے لیے اشتراکی انقلاب کی ابتدا کے ساتھ ہی حسب ذیل طریقے اختیار کیے گئے:

(۱) سترہ اور بتیس سال کے درمیان کی تمام عورتیں ریاست کی ملک قرار دے دی گئیں اور ان پر سے ان کے شوہروں کے حقوق ساقط کر دیے گئے۔

(۲) بچوں میں یہ رجحانات پیدا کیے گئے کہ وہ اپنے والدین کے خلاف حکومت میں جاسوسی کریں۔

(۳) پہلے ہر مرد اور عورت پر یہ لازم کیا گیا کہ جو کام اس کو دیا جائے وہ بہرحال اس کو کرنا ہوگا۔ پھر یہ کیا جانے لگا کہ شوہر کو اگر ایک شہر میں کام دیا جاتا تو بیوی کو کسی دوسرے شہر میں کام پر لگایا جاتا۔

(۴) اس صورت حال سے جب بعض شوہروں اور بیویوں کی مشکلات محسوس ہوئیں تو لیبر بورڈ نے ان مشکلات کا یہ حل نکالا کہ میاں اور بیوی دونوں کو یہ اختیار دے دیا کہ اپنی اپنی جگہ پر جس کو چاہیں میاں اور بیوی بنالیں اور ساتھ ہی

جائز اور حرامی بچوں کو تمام حیثیتوں سے برابر کر دیا گیا۔

(۵) عورتوں کی 'سہولت' کے لیے ملک میں جگہ جگہ سرکاری اہتمام میں حمل گرانے کے مرکز قائم کر دیے گئے تاکہ جو عورتیں اپنے جائز یا ناجائز حمل گرانے کی خواہشمند ہوں اُن کو کوئی زحمت نہ پیش آئے۔

ان باتوں سے جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ چند ہی سالوں میں ملک کا یہ حال ہو گیا کہ لاوارث اور آوارہ بچے باؤلے کتوں کی طرح گلی کوچوں میں پھرنے اور چوری، مارپیٹ اور قتل تک کی وارداتیں کرنے لگے۔ لینن کی بیوی کے اندازہ کے مطابق ایسے بچوں کی تعداد ستر لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ بچوں کے جرائم کا مسئلہ اتنا اہم ہو گیا تھا کہ ۷ اپریل ۱۹۳۵ء کو مرکزی انتظامیہ کمیٹی اور سرکاری محکموں کے اعلیٰ افسروں کی کونسل نے متفقہ طور پر یہ قرار دیا کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچوں کو پوری یعنی بالغ آدمیوں کے برابر سزا دی جایا کرے۔

۱۹۳۴ء میں ماسکو کے شفاخانوں میں ۵۷,۰۰۰ ولادتوں کے مقابلہ میں ۱,۵۴,۰۰۰ حمل گرائے گئے اور دیہات میں ۲,۴۲,۹۷۹ ولادتوں کے مقابلہ میں ۳,۲۴,۱۹۴ حمل گرائے گئے۔ گویا شہروں میں پیدا ہونے والے ہر چار بچوں میں سے تین کو رحمِ مادر ہی میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

طلاقوں کی کثرت کا یہ حال ہوا کہ ۱۹۳۵ء کے پہلے پانچ مہینوں میں رجسٹری شدہ شادیوں کے مقابلہ میں طلاقوں کی تعداد ۳۸ فی صد زیادہ تھی۔ یعنی جہاں ایک سو شادیاں ہوتیں وہاں ۱۳۸ جوڑے منتشر ہو جاتے۔ مئی ۱۹۳۵ء میں یہ تعداد ۴۴.۳ فی صد تک پہنچ گئی۔

عورت کی آزادی کے یہ شاندار نتائج جب سامنے آ گئے تو اشتراکیوں کی آنکھیں ذرا کھلیں۔ جس طرح اس سے پہلے لینن کو کچھ مدت تک فطرت سے لڑنے کے بعد

یہ معلوم ہوا تھا کہ ملک ذاتی کی کامل نفی کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو بھوکا مار دیا جائے اسی طرح ان ہولناکیوں کو دیکھنے کے بعد اس کے جانشینوں پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ گھر اور خاندان کی بربادی خود قوم اور ریاست کی بربادی ہے۔

چنانچہ اس کے بعد انہوں نے یک لخت پلٹی کھائی، اور یا تو یہ حال تھا کہ رشتۂ نکاح اور زن و شوہر کی وفاداری سے زیادہ کوئی چیز لائق تمسخر نہ تھی یا دفعتہً یہ حال ہوا کہ مشہور اخبار ازنیستیا (IZNESTIA) نے اپنی ۱۴۔جولائی ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں اس بات پر زور دیا کہ:

"وقت آگیا ہے کہ ازدواجی زندگی میں خیانت کو قانونی جرم قرار دیا جائے اور لوگوں پر واضح کر دیا جائے کہ تعلقاتِ زن و شو میں بے وفائی اشتراکی اخلاق کی رُو سے سخت معیوب اور قابل مواخذہ ہے۔"

اب تک حکومت کے سارے وسائل و ذرائع اپنا سارا زور استقاطِ حمل، طلاق اور آزادانہ عشق بازی کی تبلیغ و ترویج پر صرف کر رہے تھے اور اب اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ان چیزوں کی مذمت پر زور صرف کرنے لگے۔ والدین کے حقوق اور مرتبہ کو تسلیم کیا جانے لگا۔ بچوں کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری پھر والدین پر ڈالی جانے لگی۔ کثرت سے ایسا لٹریچر شائع کیا جانے لگا جس میں طلاق اور استقاطِ حمل کی خطرناکیوں اور ان کے گھناؤنے پن کا اظہار ہوتا۔ شفقت پدری محبت مادری کے گُن گائے جانے لگے۔ گھریلو زندگی کے محاسن، اُس کے فوائد اور اُس کی برکتیں دلوں میں بٹھائی جانے لگیں۔ حکومت کی طرف سے یہ احکام جاری کیے گئے کہ جگہ جگہ کانفرنسوں اور جلسوں کے ذریعہ سے گھر اور خاندان کی خوبیاں لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ ابھی چودہ پندرہ برس پہلے جو اخبار نویس، جو ادیب اور جو ترقی پسند مصنفین گھر اور خاندانی نظام کی برائیوں اور تباہ کاریوں پر سارا زورِ قلم صرف کر رہے تھے اب وہ اس سے

زیادہ زور و قوت کے ساتھ لوگوں کو یہ سمجھانے اور سکھانے لگے کہ گھر اور خاندان کے نظام کو مضبوط کرنا ابتدائی اشتراکی اخلاق ہے اور جو لوگ طلاق کا ناروا استعمال کریں وہ سزا کے مستحق ہیں۔

محکمۂ انصاف کے سرکاری رسالہ نے عہدِ نکاح کی دوامی حیثیت کی توثیق کرتے ہوئے لکھا کہ شادی کی قدر و اہمیت اسی صورت میں ہے جبکہ فریقین اس کے ذریعہ زندگی بھر کے ملاپ کا ارادہ رکھتے ہوں۔ آزادانہ عشق بازی بورژوائی کردار ہے۔ سویت باشندوں کو اس سے احتراز واجب ہے۔

۱۹۳۶ء میں ماہرینِ قوانین و عمرانیات کے کمیشن کے صدر سٹولز (STOLZ) نے مندرجہ ذیل سفارشیں کیں:

(۱) نکاح ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اب تک طلاق بہت سہل چیز رہی ہے، ضرورت ہے کہ آئندہ اسے دشوار بنایا جائے۔

(۲) ایک سوشلسٹ ملک میں اسقاطِ حمل کے جواز کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۳) اشتراکی عورت بلاشبہ مرد کی ہم رتبہ ہے، لیکن وہ اس عظیم فرض سے سبکدوش نہیں کی جاسکتی جو قدرت نے اُس پر عائد کیا ہے، یعنی ماں بننے کا فرض۔ اس کی زندگی دُہری اہمیت رکھتی ہے، ایک اس کی شخصی حیثیت سے، دوسری ماں ہونے کی حیثیت سے!

اس کے بعد رشتۂ نکاح اور خاندان کے نظام کے استحکام کے لیے اشتراکیوں نے جو قوانین نافذ کیے اور جو اصلاحات جاری کیں وہ یہ ہیں:

(۱) پوسٹ کارڈوں کے ذریعہ سے طلاق دینے کا طریقہ منسوخ کر دیا گیا۔

(۲) طلاق پر فیس عائد کر دی گئی، مثلاً پہلی طلاق پر ۵۰ روبل، دوسری پر ۱۵۰ روبل، تیسری پر ۳۰۰ روبل اور بعض حالات میں اس کی شرح ۲۰۰۰

رد و بدل تک کر دی گئی۔

(۳) طلاق کو ایک قابلِ نفرت شے بنانے کے لیے طلاق دینے والے اشخاص کے پاسپورٹوں پر بھی اُن کی اس خصلت اور اُن کے طلاقوں کی تعداد کا اظہار ضروری سمجھا گیا۔

(۴) جائز اور حرامی بچوں کے درمیان امتیاز کو بحال کر دیا گیا۔

(۵) اِسقاطِ حمل کو قتل کا ہم معنی جرم قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا مشورہ دینے والے تک کے لیے دو سال قید کی سزا مقرر کی گئی۔

(۶) غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں اور تین سے کم بچوں والے والدین پر ٹیکس عائد کر دیا گیا۔

(۷) بچوں کی پیدائش کی ترغیب دینے کے لیے عورت کو زچگی کے دنوں میں رعایتیں اور سہولتیں بہم پہنچانے کا اور بچوں کے لیے وظائف کا طریقہ جاری کیا گیا۔

(۸) جن بچوں کو پہلے والدین کے خلاف جاسوسی کرنے پر اُکسایا جاتا تھا، اب اُن کو یہ تعلیم دی جانے لگی کہ بچوں کو اپنے ماں باپ سے محبت اور اُن کی عزت کرنی چاہیے، اگرچہ وہ پرانی وضع کے ہوں اور بچوں کی اشتراکی لیگ سے نفرت بھی کرتے ہوں۔

(۹) اسٹالن نے خود بچوں سے میل جول کا اظہار شروع کیا اور اُن کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ اس طرح سے بیس سال کے اندر اندر ہی گھر اور خاندان اور زن و شو کے تعلقات سے متعلق اشتراکیوں نے اپنے سارے فلسفہ کو لپیٹ کر رکھ دیا اور تجربہ نے ان پر واضح کر دیا کہ وہ بالکل غلط راہ پر چل پڑے تھے۔ اب وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے سکولوں اور کالجوں کو بھی ایک دوسرے سے الگ کرنے اور مخلوط تعلیم کے طریقہ کو ختم کرنے پر بھی زور دے رہے ہیں۔ اُن

کا تجربہ یہ ہے کہ ان مشترک اداروں کی وجہ سے عورتوں اور مردوں میں صرف ذہنی انارکی اور اخلاقی آوارگی ہی نہیں پیدا ہو رہی ہے، بلکہ ملک کی اجتماعی اور فوجی قوت پر بھی اس کا بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔

یہ سب کچھ اشتراکیوں نے کیا۔ لیکن اب بھی چونکہ اصلی غلطی وہاں جُوں کی تُوں باقی ہے اور عورت کو خاندان کی ذمہ داریوں سے الگ کر کے کارخانوں اور دفتروں میں لگا رکھا گیا ہے اس وجہ سے ان تمام اصلاحات کے باوجود بھی وہاں عورت سے بچے جنوانے کے لیے اس کو انعام اور تمغہ اور الاؤنس کا لالچ دینا پڑ رہا ہے۔ عام حالات کے اندر جبکہ عورت اور مرد، دونوں فطری تقسیم عمل کے مطابق اپنے اپنے دائروں کے اندر زندگی بسر کر رہے ہوں، عورت کے لیے ماں بننے اور مرد کے لیے باپ بننے کی خواہش ایک فطری خواہش ہے۔ جس طرح وہ کھانا کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور اپنے ان کاموں پر کسی سے تمغہ اور انعام کے طلب گار نہیں ہوتے، اسی طرح وہ ماں اور باپ بننے پر بھی کسی سے تمغہ لینے اور الاؤنس پانے کے خواہشمند نہیں ہوتے۔ مرد اپنی رجولیت کا یہ تقاضا سمجھتا ہے کہ وہ باپ بنے اور اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو ناقص سمجھتا ہے اور عورت اپنی انوثت کا یہ مقتضیٰ سمجھتی ہے کہ وہ ماں بنے اور اس کے بغیر وہ صرف اپنی گود ہی خالی نہیں پاتی، بلکہ اس کو اپنی ہستی ہی سرے سے بے معنی اور بے مقصد معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن جب عورت کو اس کی اصلی جگہ سے ہٹا کر اس کو دفتروں اور کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے تو بچہ جننا اُس کے لیے پہاڑ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس غرض کے لیے اسٹالن صاحب کو امومت (MOTHERHOOD) کا تمغہ جاری کرنا پڑتا ہے اور جس طرح میدانِ جنگ میں غیر معمولی بہادری کا کوئی کارنامہ انجام دینے پر بہادر سپاہی کو تمغہ دیا جاتا ہے اسی طرح سویت روس میں وہ عورت بڑی تیس مار خانم سمجھی جاتی ہے جو بچے جنتی ہے اور اس کارنامے پر اس کو تمغہ دیا جاتا ہے۔

امریکہ میں خاندانی نظام اور معاشرہ کا حال:

اب ذرا امریکہ کا حال ملاحظہ ہو کہ وہاں عورت کو خاندان کے نظام سے الگ کر کے معاشی اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروف کرنے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا ہے اور اس کی وجہ سے وہاں کے اہل نظر کس طرح بیک وقت خاندان، معاشرہ اور ریاست' تینوں کی تباہی کے اندیشوں سے پریشان ہیں۔ اس سلسلہ میں اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے میں ایک مفکر کے بجیدی کی شہادت کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اس لیے فلٹن، جے شین (FULTON J SHEEN) کی کتاب (COMMUNISM AND CONSCIENCE OF THE WEST) سے خود اس کے الفاظ میں امریکہ میں خاندان کے حال کا نقشہ پیش کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے:

"امریکہ کی گھریلو زندگی میں جس قدر ہیجان اس وقت پایا جاتا ہے اس کی مثال اس ملک کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اپنی قوم ۔ مصنف کا خطاب اپنے اہل قوم سے ہے ۔ کے متعلق ہر پہلو سے ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا ہو تو اس کی گھریلو زندگی کو دیکھ لیجیے۔ جو حالت آپ ایک متوسط گھرانے کی پائیں بس وہی حالت پورے امریکہ کی سمجھ لیجیے۔

"اگر ایک متوسط گھرانہ قرض پر گزر کر رہا ہے' اسراف میں مبتلا ہے، مقروض ہوتا جا رہا ہے تو یقین کر لیجیے کہ امریکہ قومی قرضوں کے نیچے دبتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔ اگر ایک متوسط گھر کے میاں اور بیوی ایک دوسرے سے وفاداری نہیں برت رہے ہیں تو جان لیجیے کہ امریکہ اٹلانٹک چارٹر اور چار آزادیوں کی پابندی پر استوار نہیں رہے گا۔ اگر گھروں کے اندر جان بوجھ کر قصداً بچوں کی پیدائش کو روکا جا رہا ہے تو قوم میں لازماً یہ ذہنیت

پرورش پائے گی کہ وہ قیمتوں کو برقرار رکھنے کی خاطر فصلوں کو برباد کرے، قہوہ کو سمندر برد کرے اور زندگی کو اس کے فطری نہج پر حرکت کرنے سے روکے۔ اگر گھر کے اندر میاں بیوی خود غرضی سے کام لے رہے ہیں، ایک دوسرے کے مفاد اور احساسات کو نظر انداز کر رہے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی خوشی اور بھلائی کا انحصار دوسرے کی خوشی اور بھلائی پر ہے تو آپ کے ملک میں سرمایہ اور محنت کے درمیان وہ صورت پیدا ہو کر رہے گی جو گھر کے اندر میاں اور بیوی کے درمیان پیدا ہو چکی ہے اور وہ سوسائٹی کو اس کے اجتماعی امن اور اس کی محنتوں کے پھل سے اسی طرح محروم کر دے گی جس طرح میاں اور بیوی نے گھر کو ان سے محروم کر رکھا ہے۔ اگر اپنی گھریلو زندگی میں میاں اور بیوی ایک دوسرے کو غیروں سے آنکھ لڑانے کی گنجائش دے رہے ہیں تو ہماری قوم لازماً ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائے گی جس کے اندر بیرونی فلسفے اور نظریات آگھسیں اور وہ قوم اور ملک سے لوگوں کی وفاداری کو اس طرح ختم کر دیں جس طرح اشتراکیت ہر ملک میں ان کو ختم کر رہی ہے۔ اگر ایک امریکی گھر کے اندر میاں اور بیوی خدا سے آزاد اور بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں تو پورے امریکہ میں ضرور وہ لوگ برسرِ اقتدار آئیں گے جو الحاد اور زندقہ کو قومی پالیسی کے طور پر اختیار کرنے پر زور دیں۔ قومی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کا سارا انحصار گھر کی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ پر ہے۔ گھر ہی قوم کی زندگی میں فیصلہ کن ادارہ ہے۔ جو کچھ آپ کے گھروں میں ہوگا وہی کچھ آپ کی اسمبلیوں میں ہوگا، وہی کچھ آپ کی کیبنٹ اور سیکرٹریٹ میں ہوگا اور وہی کچھ آپ کی عدالتِ عالیہ میں ہوگا۔ جیسی کچھ ہمارے گھروں کے اندر کی زندگی ہوگی بعینہٖ اُسی طرح کی ہماری اجتماعی زندگی ہوگی۔

جب ہمارے ملک کے ۲۰ بڑے شہروں میں طلاق کی شرح اس حد کو پہنچ جائے کہ ہر دو شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق ہو، جب قوم کے اندر سال بھر کی کل ۲۲،۸۵،۰۰۰ شادیوں میں ۶،۰۰،۰۰۰ کا حشر طلاق ہو رہا ہے تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ امریکہ کو اندر سے گھن لگ چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کو بھی سامنے رکھیے کہ لوگوں کی کتنی بڑی تعداد کو فوجی خدمت کے لیے ناکارہ قرار دے کر واپس کیا جا رہا ہے۔ زنانہ آگزیلری کور کے لیے امیدوار لڑکیوں میں سے ایک تہائی کو صرف دماغی اور اعصابی بیماریوں کی بنا پر واپس کیا گیا۔ اسی طرح پندرہ لاکھ مردوں کو بھی انہی اسباب سے واپس کر دینا پڑا۔ قتل کی وارداتیں ۱۹۰۰ء میں ۲،۴ فی لاکھ تھیں، ۱۹۴۱ء میں یہ ترقی کر کے ۹ فی لاکھ تک پہنچ گئیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ذہنیتیں دشمنِ اجتماعیت (ANTI-SOCIAL) رجحانات کی راہ پر جا رہی ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد شراب کی وجہ سے دماغی امراض میں ۵۰۰ فی صد اضافہ ہو گیا ہے اور یہ بات اب قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ بہت سی عورتوں کی دماغی اور اعصابی بیماری کا اصل سبب ان ذمہ داریوں کے آ پڑنے کا خوف ہے جو قدرت نے ماں کی حیثیت سے اُن کے سپرد کی ہیں۔ اسی طرح مردوں میں بھی تلوّن کا سبب باپ بننے کی ذمہ داریاں سر آ پڑنے کا خوف ہی ہوتا ہے۔ طلاق رنج و غم ہی کا آخری مظہر ہوتی ہے اور اس سے پہلے فریقین پر ایک مدت تک ذہنی پریشانی اور دماغی عدمِ توازن کی حالت طاری رہتی ہے۔ امریکہ میں ۸۲ فی صد طلاقیں اُن جوڑوں میں ہوتی ہیں جن کے ہاں کوئی بچہ نہیں پیدا ہوا ہوتا۔ تعلیم اس کا کوئی علاج نہیں ہے، کیونکہ کالجوں سے نکلی ہوئی ۴۵ فی صد اور سکولوں سے نکلی ہوئی ۲۱ فی صد

عورتیں بچے پیدا کرنے کے ناقابل ثابت ہو رہی ہیں۔[1]

خاندان کی زندگی کے انتشار کی وجہ سے امریکن قوم اور امریکی ریاست کو جو خطرات درپیش ہیں، مصنف ان خطرات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"امریکہ اپنی گھریلو زندگی میں جس راہ پر جا رہا ہے اس کو اس نے اگر ترک نہ کیا تو مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے الگ سراسر دنیوی نقطۂ نظر سے بھی وہ نہایت ہولناک نتائج سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اوّلاً یہ کہ امریکن بتدریج ایک غداروں کی قوم بنتے چلے جائیں گے۔ جس قوم کے اندر پچاس فی صد لوگ یہ سمجھنے لگ جائیں کہ وہ جب چاہیں محض اپنی خوشی، اور سہولت کی خاطر نکاح کے مقدس عہد کو بلا تامل توڑ کر پھینک دے سکتے ہیں، سمجھنا چاہیے کہ اس قوم کی زندگی میں وہ ساعت آن پہنچی ہے جب کہ اس کے شہری ملک و قت سے وفاداری کے عہد کو کوئی اہمیت دینا چھوڑ دیں گے جب کسی ملک کے شہریوں کا لگاؤ گھر سے ختم ہو جائے جو دولت مشترکہ اور حکومت خود اختیاری کا اصل مرکز ہے تو زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ قوم اور وطن سے بھی ان کا لگاؤ باقی نہیں رہے گا۔ جس ملک میں بیگم الف ہر آن بیگم جیم بننے کے لیے تیار رہیں اس ملک کے باشندوں کو غیروں سے ساز باز کرنے

---

[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں یا تو کنواری مائیں بننے کے خوف سے بچے پیدا کرنے کے اعضاء کو ناکارہ کروا لیتی ہیں یا منع حمل اور اسقاطِ حمل کی تیز دوائیں ان کو ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ اس سے سکولوں اور کالجوں کی اندرونی حالت اور اُن کی تربیت کے نتائج کا اندازہ کیجیے اور پھر اس امر پر غور فرمائیے کہ جب امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں، جہاں منع حمل اور اسقاط کا فن اس قدر ترقی کر چکا ہے، ناکارہ ہو جانے والی لڑکیوں کا یہ اوسط ہے تو جہاں یہ فن شریف اس درجہ ترقی یافتہ حالت میں نہیں ہے، جیسے ہمارا ملک، وہاں ناکارہ ہو جانے والی لڑکیوں کا اوسط کیا ہوگا؟

— امین احسن اصلاحی —

سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جو آج گھر میں غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ کل قوم کے ساتھ غداری کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔

ثانیاً یہ کہ لوگوں کی ذہنیتیں ایسی بنتی چلی جائیں گی کہ پھر کوئی شخص ملک و ملت کی خاطر ایثار کرنے، ان کے لیے مصائب جھیلنے، ان کے فائدہ کی خاطر مشقت اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ کیونکہ گھر ہی تو وہ جگہ ہے جہاں افرادِ قوم کو ضبطِ نفس کا، اجتماعی مفاد کے پاس و احساس کا اور دوسروں کے ساتھ مل کر اور ان کے واسطے زندگی بسر کرنے کا سبق ملتا ہے۔ گھر ہی وہ درس گاہ ہے جہاں آدمی کو اپنی خوشی کو دوسروں کی خوشی پر، اپنی خواہشوں کو دوسروں کی خواہشوں پر، اپنے آرام کو دوسروں کے آرام پر، حتیٰ کہ اپنی جان کو دوسروں کی جان پر، بغیر کسی بدلہ یا غرض کے اور بغیر کسی تردد کے قربان کر دینے کی تربیت ملتی ہے۔۔۔۔ مگر گھروں کے اندر ہیرو پیدا کرنے کا انتظام باقی نہ رہے گا، تو قوم کے اندر ہیرو کہاں سے آئیں گے؟ جو لوگ اپنے بال بچوں کے لیے محنت و مشقت کرنے سے بھاگیں گے، وہ قوم و ملک کی خاطر کیوں اور کس طرح مشقت کریں گے؟۔۔۔۔ ایثار و قربانی کی تربیت کے لیے جب گھر کا نظام باقی نہیں رہے گا تو قوم کے اندر سے اس چیز کی جڑ ہی کٹ جائے گی۔[1]"

ان اقتباسات سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت روس اور امریکہ دونوں ملکوں میں خاندان کے نظام کی ابتری کا کیا حال ہے اور اس کے سبب سے ان کا پورا معاشرتی اور اجتماعی نظام کس طرح سے دوچار ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عورت اور مرد

---

[1] ملاحظہ ہو فلپس جے بشپ کی کتاب کمیونزم اینڈ دی کانشنس آف دی ویسٹ ص ۱۴۸، ۱۵۱

کے فرائض کی قدرتی تقسیم کو توڑ کر خاندان کے نظام کو عورت کی نگرانی سے محروم کر دیا ہے۔ ان حالات سے ان حضرات کو سبق لینا چاہیے جو کبھی امریکہ کے نظام کو اسلام سے قریب تر پاتے ہیں اور کبھی روس کے نظام کو عین اسلام سمجھ بیٹھے ہیں[1]۔

نقصان جو ریاست کو پہنچتا ہے:

ریاست کے نظام میں عورت کی براہ راست شرکت سے خود ریاست کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورت کی فطرت اور سیاست کے مزاج میں فطری نامناسبت ہے۔ عورت کے مزاج میں فعل سے زیادہ انفعال، کسر سے زیادہ انکسار اور تاثیر سے زیادہ تاثر کا غلبہ ہے۔ وہ زود حس بھی واقع ہوئی ہے اور شدید التاثر بھی۔ اس وجہ سے واقعات و حالات سے وہ جلد اثر پذیر بھی ہوتی ہے اور اس کا یہ اثر تیز اور شدید بھی ہوتا ہے۔ اس کی یہ فطرت اس کے فطری دائرہ کے اندر، جہاں معاملہ صرف اپنوں سے ہے، اُس کے فرائض کے لحاظ سے نہایت موزوں (اور ضروری بھی) ہے۔ اس کے سبب سے وہ متعلق افراد یعنی شوہر اور اولاد کے لیے سراپا ایثار و محبت

---

[1] روس اور امریکہ میں خاندان کے نظام کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ اگر ان مسلمان ملکوں کے حالات کا اندازہ کرنے کا شوق ہو جو مغربیت کے راستے پر جا رہے ہیں تو مصر کا حال ملاحظہ ہو۔

مصری اخبارات نے حال ہی میں ایک غیر ملکی خاتون نامہ نگار کی رپورٹ شائع کی ہے۔ یہ نامہ نگار رقم طراز ہے کہ میں حال ہی میں ایک میٹنی شو دیکھنے گئی۔ سینما ہال کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ دفعۃً فلم دکھانا بند کر دیا گیا اور مینیجر نے اعلان کیا کہ ایک شخص باہر کھڑا یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی بیوی کسی شخص کے ہمراہ سینما دیکھ رہی ہے اور اگر وہ باہر نہ آئی تو وہ گڑبڑ پیدا کرے گا۔ لہٰذا میں پانچ منٹ کے لیے بتیاں بجھا دیتا ہوں اور اس خاتون سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سینما ہال سے باہر تشریف لے جائے۔ لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب پانچ منٹ کے بعد دوبارہ بتیاں جلائی گئیں تو میرے سوا سینما ہال میں اور کوئی عورت موجود نہ تھی۔

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور: ۲۴ مارچ ۱۹۵۰ء)

بنی ہوئی رہتی ہے۔ اُن کی ہر ضرورت اور ہر تکلیف کا وقت سے پہلے احساس کر لیتی ہے
اور جب احساس کر لیتی ہے تو اس کے ازالہ کے لیے اس کے اندر ایسی بے چینی اور
بے قراری پیدا ہو جاتی ہے کہ جب تک اسے دور نہ کر لے اس کو چین نہیں پڑتا، اگرچہ
اس کے لیے اسے سب کچھ قربان کر دینا پڑے۔ لیکن سیاست کے اندر اس کا یہ مزاج
نہ تو خود اس کے لیے مناسب حال پڑتا ہے اور نہ ریاست کے۔ اوّل تو حکومت کا مزاج
انفعال سے زیادہ فعل، انکسار سے زیادہ کسر اور تاثر سے زیادہ تاثیر کا متقضی ہے۔
اس کی خصوصیات مردانہ ہیں، وہ اپنا ایک متعین ارادہ رکھتی ہے اور اس ارادہ کو فاعلانہ
عزم اور آمرانہ زور و قوت کے ساتھ نافذ کرنا چاہتی ہے۔ ثانیاً اس کے معاملات
نہایت پھیلے ہوئے، اپنوں اور بے گانوں ہر ایک سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔
اس لیے اس کے انصرام میں وہی رویہ زیادہ قرینِ مصلحت و سیاست ہوتا ہے جس میں
جذباتی پن سے زیادہ سکونِ مزاج اور سرعت و جلد بازی سے زیادہ عزیمت غالب ہو۔
چنانچہ عورت ہی کی کچھ خصوصیت نہیں ہے وہ مرد بھی ریاست کے لیے نامزوں ہوتے
ہیں جو جذباتی اور ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ اگر حکومت کے کاموں میں
دخیل ہو جاتے ہیں تو اپنی صحت بھی کھو بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات سلطنت کو بھی خطرہ
میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

انفعالی عناصر (PASSIVE ELEMENTS) کی زیادتی یوں تو کسی ریاست کے
مزاج کے بھی مناسب حال نہیں ہے۔ لیکن ایک اسلامی ریاست تو خصوصیت کے ساتھ
اس کا تحمل نہیں کر سکتی۔ موجودہ زمانے کی جمہوری حکومتیں، جو عوام کی نمائندہ ہوتی ہیں
اور جن کا کام اپنے آپ کو عوام کی پسند کے رنگ میں رنگنا ہے، وہ تو ممکن ہے کہ ایک حد
تک اس کو برداشت بھی کر لے جائیں، لیکن اسلامی حکومت جس کا اصلی مقصد عوام کے
رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کے بجائے لوگوں اور اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگنا

اور اس کی مرضی پر چلانا ہے اور صرف کسی ایک دائرہ ہی کے اندر نہیں، بلکہ خدا کی پوری زمین پر اس کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا ہے، وہ تو مشکل ہی سے اس کو برداشت کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بھی ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ اہل ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنایا ہے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: 'لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ'۔[1] (وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جنہوں نے اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں دے دی ہے)

فلسفۂ سیاست کا مشہور فرانسیسی عالم، بلنچلی بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب 'نظریۂ سلطنت' (THE THEORY OF THE STATE) میں لکھتا ہے:

"جن عورتوں نے سیاست میں شہرت پائی ہے، انہوں نے عموماً ریاست کو اور اپنے دوستوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی ہوشیاری اور ذکاوت نے ایک سازش کی شکل اختیار کر لی ہے اور جب ایک مرتبہ سیاسی نفرت، انتقام اور حسد کے جذبات عورت کے سینہ میں بھڑک اٹھے ہیں تو وہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے ہیں۔ یہ بات صرف بادشاہوں کی آشناؤں ہی کی حد تک صحیح نہیں ہے، بلکہ بہت سی بیویوں اور ماؤں کے متعلق بھی صحیح ہے، جو تاریخ میں مشہور ہوئی ہیں۔ روم کی تاریخ، انقلاب فرانس کی سرگزشت اور شاہان فرانس کے درباروں کے حالات، سب سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔"

دوسری عالمی جنگ کے موقع پر فرانس کے لیڈروں نے بھی اس امر کا اقرار کیا کہ ان کی شکست میں سب سے زیادہ ہاتھ ان عورتوں کا ہے جو سیاست میں دخیل تھیں۔ اسلامی تاریخ کی شہادت اس بارہ میں جو کچھ ہے اس کو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب ۸۲

اسلامی ریاست میں عورتوں کے حقوق و فرائض

اسلامی ریاست میں جس طرح مردوں کو حقوق حاصل ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی حقوق حاصل ہیں اور جس طرح مردوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بحیثیت شہری کے ایک مسلم اور ایک مسلمہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن دونوں کے حقوق و فرائض کی نوعیت میں کچھ اختلاف ہے اور یہ اختلاف دو اہم حقیقتوں پر مبنی ہے۔ جن کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

اولاً یہ کہ اسلام مساواتِ مرد و زن کے اس مغربی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا جو عورت اور مرد کی صلاحیتوں میں سرے سے کوئی فرق نہیں کرتا اور دونوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بالکل یکساں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام اس مساوات کو مساوات نہیں قرار دیتا، بلکہ اس کو ظلم قرار دیتا ہے؛ کیونکہ اول تو عورت اور مرد کے طبعی رجحانات و میلانات میں بڑا فرق ہے، دوسرے خاندان کی ذمہ داریوں کا ایک بہت بڑا بوجھ پہلے سے عورت کے اوپر لدا ہوا ہے، جس کو اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ اس وجہ سے یہ بالکل خلافِ انصاف ہے کہ اس کے اوپر ریاست کی ذمہ داریاں بھی بالکل مرد کے برابر لاد دی جائیں۔

ثانیاً اسلام معاشرہ کے اخلاقی تحفظ کے لیے دونوں جنسوں کو الگ الگ رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ پردہ کے احکام دیے ہیں، اس وجہ سے اسلامی نظام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ عورت اور مرد،

دونوں معاشی و سیاسی سرگرمیوں میں دوش بدوش حصّہ لے سکیں۔ بلکہ وہ لازماً دونوں کے لیے الگ الگ دائرۂ عمل معیّن کرتا ہے۔ یہ علیحدگی اخلاقی پہلو سے قطع نظر عورت کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی منصفانہ ہے؛ کیونکہ مشترک دائرہ کے اندر یہ لازمی ہے کہ مرد اپنی فطری برتری کی وجہ سے عورت پر حاوی رہے گا جس کے سبب سے عورت کے حقوق تلف ہوں گے اور اگر عورت کا دائرۂ عمل الگ ہو تو اپنے دائرہ کے اندر اس کو پوری خود مختاری حاصل رہے گی۔

ان دو اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اب آیئے عورت کے حقوق و فرائض پر غور کیجیے۔[1]

عورت کے حقوق:

جہاں تک حقوق کا تعلق ہے، اسلامی ریاست عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں کرتی۔ چنانچہ

(۱) اسلامی ریاست ہر عورت کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کا ذمہ لے گی۔

(۲) عورت اپنی ملکِ ذاتی (PRIVATE PROPERTY) رکھ سکے گی اور ریاست اس کے اس حق کی محافظ ہوگی۔

(۳) شریعت نے عورت کو جو حقوق دے رکھے ہیں ریاست اس بات کی ذمہ دار ہوگی کہ ان حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لیے عورت کو پوری آزادی حاصل ہے۔ رسم و رواج وغیرہ کے قسم کی چیزیں اس کی آزادی اور اس کے حقوق پر اثر انداز نہ

[1] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کے دو ابواب میں کی ہے۔ ایک میں شریعت کے عام حقوق و فرائض سے بحث کی ہے اور دوسرے میں خاص عورتوں کے حقوق و فرائض کی وضاحت ہے۔ اس وجہ سے ہم یہاں صرف سرسری اشارات پر اکتفا کریں گے۔ جو لوگ اس مسئلہ کی تفصیلات اور دلائل کے طالب ہوں انہیں مذکورہ ابواب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

ہو سکیں۔

(۴) عورتوں کو تحریر و تقریر کی پوری آزادی حاصل ہو گی، وہ اپنی انجمنیں بنا سکیں گی، اپنے اخبار اور رسالے نکال سکیں گی، حکومت پر تنقید کر سکیں گی، اپنے اسلامی حقوق کا مطالبہ کر سکیں گی، ہر قسم کے عام ملکی مسائل پر آزادانہ اظہار رائے کر سکیں گی۔

(۵) عورت کی شخصی آزادی بالکل محفوظ ہو گی۔ شریعت کی مقررہ پابندیوں کے سوا اور کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کی جائے گی۔

(۶) اسلام کے حدود کے اندر مسلک و مذہب اور رائے و خیال کی جو آزادی مردوں کو حاصل ہو گی وہ عورتوں کو بھی حاصل ہو گی۔

(۷) عورت کو قانونی مساوات حاصل ہو گی۔ یعنی غربت و امارت اور شرافت و حقارت کی بنا پر قانون ایک عورت اور دوسری عورت میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔

(۸) نسل و نسب، غربت و امارت اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر اسلامی ریاست میں کسی کو شریف اور کسی کو کمین نہیں قرار دیا جائے گا۔

(۹) اسلامی بیت المال میں جس طرح مردوں کے حقوق ہوں گے اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہوں گے۔

(۱۰) ہر حاجت مند عورت کی جملہ ضرورت کی کفالت ریاست کے ذمہ ہو گی۔

(۱۱) جس طرح مردوں کی تعلیم کا ریاست بندوبست کرے گی اسی طرح عورتوں کی تعلیم کے لیے بھی وہ ذمہ دار ہو گی۔

(۱۲) بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام جس طرح مردوں کے لیے ہو گا اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہو گا۔

(۱۳) اگر کوئی عورت قرض چھوڑ کر مرے گی اور کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑے گی جس سے وہ قرض ادا کیا جا سکے تو ریاست اس کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ہو گی۔

(۱۴) کسی عورت کو اطاعتِ الٰہی کے خلاف کسی بات کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

(۱۵) ہر عورت کو ریاست کے بڑے سے بڑے حاکم سے درخواست و فریاد کرنے اور اس پر اعتراض و نکتہ چینی کرنے کا پورا حق ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریاں :

ان حقوق کے معاوضہ میں عورتوں پر ریاست سے متعلق مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں[1] :

۱۔ سمع و طاعت ——— جس طرح مردوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معروف میں اولوالامر کی پورے خلوصِ قلب کے ساتھ اطاعت کریں اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ معروف کے حد تک اولوالامر کے احکام کی اطاعت کریں۔ اولوالامر کے احکام سے انحراف صرف اسی شکل میں جائز ہے جب ان کا حکم شریعت کے حکم کے خلاف ہو۔

۲۔ خیر خواہی و ہمدردی ——— جس طرح مردوں پر ریاست کی ہمدردی و خیر خواہی فرض ہے اسی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ اس ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہو اس سے احتراز کرے، جو بات ریاست کے لیے نافع ہو اس کو حسبۃً للہ انجام دینے کی کوشش کرے۔ محض ذاتی اغراض و فوائد کے لیے ریاست کے ساتھ دلچسپی نہ رکھے۔ جو مفید تجویز ذہن میں آئے اس سے کارکنوں کو برابر آگاہ کرتی رہے، اس کی قدر کی جائے یا نہ کی جائے۔

---

[1] اس مسئلہ پر بھی مفصل بحث ہماری کتاب "اسلامی ریاست" کے ابواب "شہریت اور اس کے حقوق و فرائض" اور "حقوقِ نسواں" میں ملے گی۔ یہاں ہم صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کریں گے۔

جو بات ریاست کے خلاف مفاد ہوتی دیکھے اس کو ہاتھ سے روک سکے تو روک دے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس کی قابلیت نہ رکھتی ہو تو دل سے اس کو برا جانے۔ اپنی تنقید و احتساب میں بھی پوری مخلص ہو اور اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو پوری راست بازی و دیانت کے ساتھ اسے خدا کی عبادت سمجھ کر انجام دے۔

۲۔ **تعاون** —— عورتوں کے لیے ان کے حالات کے لحاظ سے کارکنانِ ریاست کے ساتھ تعاون کی مختلف شکلیں ہوں گی:

(الف) ریاست کی مجلس شوریٰ میں عورتوں کی خود ان کی منتخب کردہ نمائندہ عورتیں ہوں گی جو عورتوں سے متعلق قوانین و اصلاحات کے بارہ میں عورتوں کے نقطۂ نظر سے حکومت کو آگاہ کرتی رہیں گی اور حکومت عورتوں سے متعلق مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے گی۔ اوپر حضرت اسماء بنت یزید انصاریہؓ کا واقعہ ہم نقل کر آئے ہیں کہ وہ کس طرح عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپؐ سے سوالات کیے اور پھر آنحضرت صلعم نے کس طرح ان کو اپنا نمائندہ بنا کر عورتوں کے پاس بھیجا اور انہوں نے عورتوں کو آنحضرت صلعم کے جوابات سے آگاہ کیا۔ اسی طرح شفاء اُمّ سلیمان بن ابی حثمہ کے متعلق روایت ہے کہ:

کان عمر یقدمها	حضرت عمرؓ ان کو مشورہ میں مقدم
فی الرأی ویرضاها	رکھتے تھے، ان کی رایوں کو پسند فرماتے
ویفضلها وربما	تھے، ان کو ترجیح دیتے تھے اور بسا اوقات

وتها ماشاء من امر السوق ۔[1] اوقات بازار (مارکیٹ) کے بعض معاملات کا انتظام بھی ان کے سپرد کر دیتے تھے۔

(ب) وہ سارے شعبے جو خاص عورتوں سے متعلق ہوں گے، مثلاً زنانہ کالج اور سکول، زنانہ ہسپتال، زنانہ پولیس، زنانہ فوجی تربیت کے مراکز وغیرہ، یہ کلیتہً عورتوں کی نگرانی اور ان کے اہتمام میں ہوں گے۔ اسلامی نصب العین کے مطابق ان چیزوں کو چلانے کے لیے انہیں خود مختاری حاصل ہوگی۔

(ج) حکومت مذکورہ شعبوں کے سوا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گی بشرطیکہ وہ پردہ کے حدود کے احترام کے ساتھ انجام دی جاسکتی ہوں۔ جو عورتیں اپنی ذہانت و قابلیت کی بنا پر کسی مخصوص علم و فن میں مہارت اور کسی شعبۂ زندگی کے معاملات میں بصیرت بہم پہنچائیں گی ان کو کام کرنے کا بھی پورا موقع دیا جائے گا اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

۴۔ فوجی خدمات ——— فوجی خدمات میں براہ راست حصہ لینے اور فوج میں عملی شرکت کرنے کی ذمہ داری عورتوں پر اسلام میں نہیں ہے۔ لیکن ان کا اسلحہ کے استعمال، ہوائی حملہ کی صورت میں بچاؤ، فرسٹ ایڈ اور اس قسم کے دوسرے کاموں سے واقف رہنا ضروری ہے، اس لیے حکومت اس امر کا انتظام کرے گی کہ عورتیں اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی ضروری تربیت حاصل کریں تاکہ اگر کوئی ناگہانی صورت پیش آجائے تو عورتیں بھی ملک و ملت کی مدافعت اور جہاد کے اجر و ثواب میں شریک ہوسکیں۔

---

[1] کتاب الاستیعاب فی اسماء الاصحاب لابن عبدالبر، ص ۱۴۲

یہ سب کچھ اس غرض کے لیے کیا جائے گا کہ عورتیں فی الحقیقت اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کے قابل ہوں، نہ اس لیے کہ انہیں بنا سجا کر مہمانوں کے سامنے "تحفہ" پیش کیا جائے۔ اگر مقصود صرف ان قومی ضروریات کو پورا کرنا ہے جو عورتوں سے متعلق ہیں تو اسلام میں اس کی پوری گنجائش موجود ہے۔ لیکن اگر مقصود کچھ اور ہے تو پھر کوئی اور راہ دیکھیے، اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی رحمتہ اللہ علیہ

اسلامی معاشرہ میں

عورت کا مقام